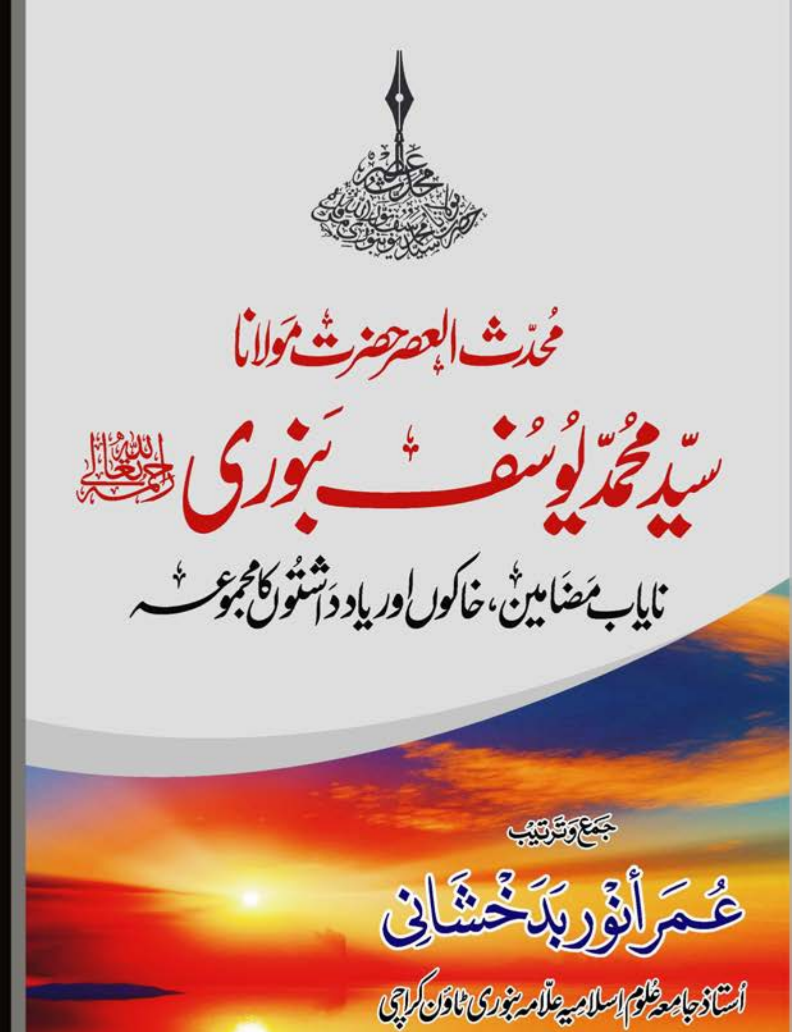
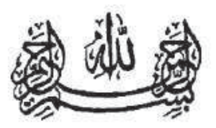


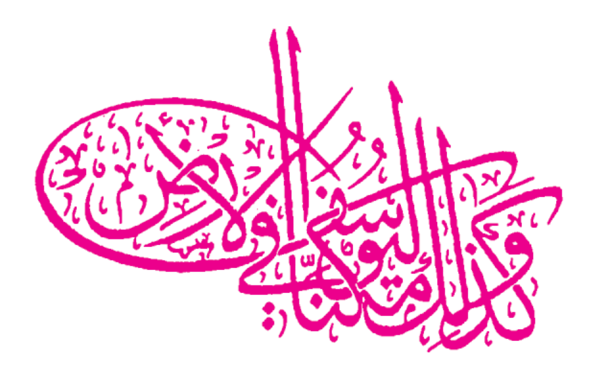
احسان دانش
ڈاکٹر احمد حسن
جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ
جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی
ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی
حافظ سید رشید احمد ارشد
ڈاکٹر رشید احمد جالندھری
مولانا زاہد الراشدی
علامہ سید سلیمان ندوی
مولانا سمیع الحق
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
مفتی سیاح الدین کاکاخیل
مولانا شمس الحق افغانی
ڈاکٹر صغیر حسن معصومی
ڈاکٹر غلام مصطفی خان
کوثر نیازی
ماہر القادری
مولانا محمد منظور نعمانی

زمزم پبلشرز



مُحدث العصر حضرت مولانا

سیّد محمّد یُوسُف بنوری نور اللہ مرقدہٗ

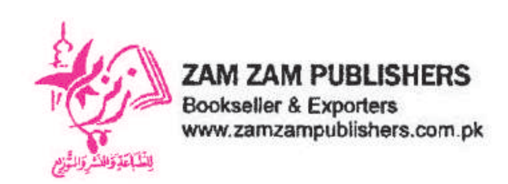


ولنعلمه من تأويل الأحاديث

والله غالب على أمره

ولكن أكثر الناس لا يعلمون





جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

2011_۱۴۳۲

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی
فون: 021-32729089
فیکس: 021-32725673
ای میل: zamzam01@cyber.net.pk
ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

Zam Zam Publishers
Urdu Bazar Karachi-Pakistan.
Ph: 0092-21-32760374
Fax: 0092-21-32725673
E-mail: zamzam01@cyber.net.pk
Website: www.zamzampublishers.com

پیش لفظ

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت، سوانح اور آپ کی علمی تصنیفات پر بہت سے مضامین لکھے گئے، یہاں تک کہ برصغیر پاک و ہند سمیت عالم عرب کی مشہور جامعات میں آپ پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات بھی تحریر ہوئے، آپ کے سانحہ وفات پر آپ کی حیات، خدمات اور کارناموں پر مشتمل تین رسالوں –سرفہرست ''بینات'' کراچی، ''خدام الدین'' لاہور اور ''لولاک'' فیصل آباد– کی طرف سے خصوصی شمارے شائع ہوئے، اس کے علاوہ دیگر رسائل وجرائد میں بھی وقتاً فوقتاً آپ پر مضامین شائع ہوتے رہے، مشہور ہے کہ اخبار کی زندگی ایک دن اور ماہانہ جرائد ورسائل کی زندگی فقط ایک ماہ ہوتی ہے، چنانچہ کسی بھی شخصیت پر خصوصی اشاعت چھپنے کے بعد وہ تاریخ کے اوراق کا حصہ بن جاتی ہے اور بہت کم ایسی نوبت آتی ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے یا کوئی ماہنامہ جریدہ ورسالہ دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہو، چنانچہ ایک وقیع علمی، ادبی وتحقیقی ذخیرہ رسائل کی گذشتہ فائلوں میں پوشیدہ ہے، بہرحال بینات کی اشاعت خاص بیاد حضرت بنوری طبع اول کے بعد اسی آب وتاب کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی اور کتب خانوں میں دستیاب ہے، لیکن مؤخر الذکر رسائل تاریخ کا حصہ بن گئے، اس بات کی ضرورت تھی کہ بینات کے علاوہ دیگر رسائل میں حضرت

بنوری رحمۃ اللہ علیہ پر مشاہیر اہل علم وقلم کے مضامین کو اکٹھا کر کے از سر نو شائع کیا جائے، چنانچہ اس مجموعے کے اکثر مضامین "خدام الدین" اور بعض "لولاک" سے لیے گئے ہیں، کچھ مضامین وہ بھی ہیں جو دیگر رسائل میں شائع ہوئے تھے، ان کو بھی اس مجموعے میں شامل کرلیا گیا ہے، چنانچہ اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مضامین کی ترتیب لکھنے والوں کے نام کی حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، چونکہ اس مجموعے کے اکثر مضامین خاکہ نگاری -ذاتی تعلق ویادداشت- کی صنف سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ابتدا میں آپ کا مکمل اجمالی تذکرہ وسوانح بھی اس میں شامل کیا گیا ہے جو آپ کے صاحبزادے استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری صاحب کا تحریر کردہ ہے، نیز مولانا زاہد الراشدی صاحب کا حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر لکھا گیا ارباب علم کے لیے لمحۂ فکریہ بطور تتمہ کتاب کے آخر میں شامل ہے جس کے مندرجات آج بھی فکر وعمل کی دعوت دے رہے ہیں۔

قارئین کے مطالعہ میں اگر ان مضامین کے علاوہ کوئی اور مضمون بھی ہو تو از راہ کرم راقم کو اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اسے بھی شامل کرلیا جائے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ہمیں اکابرین کے علوم سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محمد عمر انور
جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ
umaranwer@gmail.com

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ

يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيبُ

بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيعُ

أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيمُ ١٢ / ٩٨

كتبه الفقير نفيس الحسيني غفر الله ذنوبه وستر عيوبه

[illegible] وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ

٧ ٩ ٣ ١ ٥

يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

٧ ٧ ٩ ١ ٢

مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

خودنوشت

نام ونسب اور تعلیم

راقم الحروف محمد یوسف بن سیّد محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ البنوری الحسینی کی ولادت بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء بروز جمعرات بوقتِ سحر پشاور کے مضافات کی ایک بستی میں ہوئی۔

سلسلۂ نسب نویں جدِ امجد عارف محقق حضرت سیّد آدم بن اسمٰعیل الحسینی الغزنوی البنوری المدنی کی وساطت سے حضرت سیّدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔

قرآن کریم اپنے والد ماجد اور ماموں سے پڑھا، امیر حبیب اللہ خاں کے دور میں افغانستان کے دارالحکومت 'کابل' کے ایک مکتب میں صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس دَور کے مشہور استاذ شیخ حافظ عبداللہ بن خیر اللہ پشاوری شہید ۱۳۴۰ھ ہیں، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، معانی وغیرہ مختلف فنون کی متوسط کتابیں پشاور اور کابل کے اساتذہ سے پڑھیں، ان میں اکابر حضرت مولانا عبدالقدیر افغانی لقانی (جو جلال آباد افغانستان میں محکمہ شرعیہ کے قاضی مرافعہ تھے) اور شیخ محمد صالح قیلغوی افغانی وغیرہ ہیں۔

باقی ماندہ علوم وفنون، علم حدیث اور اصولِ حدیث کی کتابیں ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۴۷ھ تک دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں، دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کیا،

یہاں جن مشائخ سے استفادہ کیا ان میں سب سے بڑے شیخ محقق عصر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ (جو پاکستان کے شیخ الاسلام اور "فتح الملهم شرح صحيح مسلم" کے مصنف ہیں) اور امام العصر، محدث کبیر، عالم شہیر، شیخ محمد انور شاہ الکشمیری ثم الدیوبندی رحمہ اللہ ہیں، خصوصاً امام العصر رحمہ اللہ سے انتہائی استفادہ کیا، انہی سے تخرج حاصل کیا اور ایک سال سے زیادہ عرصہ تک شب و روز ان کا خادمِ خاص رہا۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے فراغت کے بعد ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایک ماہ میں پرائیویٹ تیاری کر کے مولوی فاضل کا امتحان دیا اور سند حاصل کی۔

دینی وملّی خدمات

چار سال پشاور میں جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم پر دینی وسیاسی خدمات انجام دیتا رہا، آخر میں جمعیۃ العلماء پشاور کا صدر رہا۔

(چونکہ شیخ انور رحمہ اللہ سے خصوصی استفادہ کیا اس لیے) اسی نسبت وتعلّق کی بناء پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے لیے تقرر ہوا اور بالآخر وہاں کا شیخ الحدیث وصدر مدرس بنا، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مجلس علمی کا رکن بھی منتخب کیا گیا۔

۱۹۳۷ء میں مجلس علمی نے اپنی کتابوں (فیض الباری اور نصب الرایہ) کی طباعت کے لیے مجھے مصر بھیجا اور مجلس ہی کی طرف سے مصر کے علاوہ یونان، ترکی، حجاز مقدس کا سفر بھی ہوا، مجلس کی مفوضہ علمی خدمت کو بحُسن وخوبی انجام دیا، اور اس سلسلہ میں چودہ مہینے ملک سے باہر رہا۔

جمعیۃ العلماء ہند گجرات وضلع بمبئی کا صدر بھی رہا اور بمبئی اوقاف کمیٹی کا ممبر بھی۔

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی موتمر فلسطین میں مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا مساعد رہا، چونکہ مفتی صاحب رحمہ اللہ صاحب فراش تھے اس لیے دوران کانفرنس جتنے پروگرام ہوئے اور جو بیانات وغیرہ اخبارات میں شائع ہوئے

سب میرے قلم سے نکلے۔

دارالعلوم دیوبند سے پیشکش

قیام ڈابھیل کے دوران دارالعلوم دیوبند کے طبقۂ علیا کی پیشکش بار بار کی گئی نیز دارالعلوم دیوبند میں منصب افتاء کے لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی رحمہما اللہ اور قاری محمد طیب صاحب تینوں حضرات نے اصرار فرمایا مگر قبول کرنے سے معذرت کر دی، جامعہ احمدیہ بھوپال کے لیے علامہ سیّد سلیمان ندوی نے بھی دعوت دی مگر اسے بھی قبول نہیں کیا۔

پاکستان آمد

بعض مشاہیر کے اصرار پر جنوری ۱۹۵۱ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچا اور دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار (حیدر آباد سندھ) میں شیخ التفسیر کے منصب پر تقرر ہوا، وہاں تین برس کام کیا، پھر وہاں سے مستعفی ہو کر کراچی چلا آیا اور یہاں اپنے بعض اکابر علماء کی رفاقت میں فارغ التحصیل حضرات کی تربیت کے لیے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔

اسفار

راقم الحروف کو حرمین شریفین کے سفر مقدس کا شرف بارہا حاصل ہوا، ۱۹۳۷ء میں قاہرہ کا سفر ہوا جہاں تقریباً ایک سال قیام رہا، اسی طرح عراق، مصر، لیبیا، اُردن، شام، بیروت، ایران، افغانستان، ترکی، یونان وغیرہ کے اسفار بھی کیے۔

تصنیفات

بندہ کی تصنیفات یہ ہیں:

۱-**بغية الأريب فی احکام القبلة والمحاريب**: جو قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ

میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

۲-**نفحة العنبر فی حیاة امام العصر الشیخ محمد انور:** جو دہلی سے ۱۳۵۳ھ میں طبع ہوئی۔

۳-**یتیمة البیان** (جو دراصل امام العصر مولانا الشیخ محمد انور شاہ رحمہ اللہ کی تصنیف مشکلات القرآن کا مقدمہ ہے) دہلی سے ۱۹۳۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

۴-**معارف السنن شرح جامع الترمذی:** نہایت جامع شرح ہے، ابتدائی کتاب سے کتاب المناسک کا اختتام چھ ضخیم جلدوں میں ہوا۔

متعدد کتابوں پر مقدمے بھی لکھے جن میں سے اہم یہ ہیں:

۱-**مقدمۂ فیض الباری شرح صحیح البخاری.**

۲-**مقدمۂ النصب الرایة تخریج احادیث الهدایة.**

۳-**مقدمۂ مقالات کوثری**

تینوں کتابیں مصر سے طبع ہو چکی ہیں۔

۴-**مقدمۂ عقیدة الاسلام**

۵-**مقدمۂ عبقات للشاہ اسماعیل الشهید رحمه الله.**

۶-**مقدمۂ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین.**

اس کے علاوہ اور بھی کئی مقدمات ہیں جن میں سب سے ضخیم اور قیمتی مقدمۂ معارف السنن "عوارف المنن" ہے جو سردست غیر مطبوعہ ہے، علاوہ ازیں بعض کتابوں پر تقریظیں بھی تحریر کی ہیں جن میں سے شیخ رضوان محمد رضوان کی کتاب "فهارس البخاری الکبیر" پر تقریظ بھی ہے، علاوہ ازیں راقم الحروف کے مختلف علمی موضوعات اور مسائل پر تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔

شعروسخن

عربی میں اہل علم کے انداز پر کلام (اشعار) کا مجموعہ بھی ہے جن میں بعض اشعار بہت عمدہ سمجھے گئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں دو قصیدے ہیں، جن میں سے ایک قصیدہ فائیہ ہے، جو "شذرات الأدب في مديح سيّد العجم و العرب" کے نام سے قاہرہ کے ہفت روزہ "الاسلام" کی اسراء ومعراج پر خصوصی اشاعت میں ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکا ہے، جس پر اہل فن اور اہل زبان نے خوب داد دی تھی اور اسے بہت پسند کیا تھا۔

اساتذہ

اسفار کے دوران بڑے بڑے علماء واعیان سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان سے اجازت حدیث بھی حاصل کی، ان میں سے چند حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: محقق کبیر شیخ علاّمہ محمد زاہد الکوثری، عالم کبیر شیخ خلیل الخالدی المقدسی، محدث جلیل شیخ عمر بن حمدان المحرسی المالکی المغربی، استاذ کبیر شیخ محمد بن حبیب اللہ بن مایابی الجکنی/ الحکلمی الشنقیطی (کلیہ اصول الدین مصر کے استاذ حدیث) اور محدثہ شیخہ امۃ اللہ بنت شاہ عبدالغنی المجددی محدث دہلوی ثم مدنی وغیرہ ہیں۔

تلامذہ

بلادِ حرمین میں مجھ سے بہت سے علماء نے اجازت حدیث لی ہے، جن میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں: شیخ سلیمان بن عبدالرحمن الصنیع (مکہ مکرمہ کے ادارۂ "هيئة الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" کے سربراہ) محدث شیخ حسن المشاط (مکہ مکرمہ کے مدرسہ صولتیہ کے مدرس) محترم بزرگ شیخ ابراہیم ختنی مقیم مدینہ منورہ، شیخ عبد العزیز عیون السود حمصی شامی، شیخ علی محمد مراد حموی اور عالم جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ وغیرہ۔

ان پچیس سالوں میں مختلف فنون اور حدیث وغیرہ کی بہت سی کتابیں زیر درس رہی ہیں، جن کو خوب تحقیق وتدقیق کے ساتھ پڑھایا، خصوصاً سنن ابی داؤد، جامع ترمذی

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، موطا مالک، موطا محمد، مقدمہ ابن صلاح وغیرہ، علم ادب کی کتابوں میں سے مقامات بدیع الزماں الہمدانی، مقامات حریری، مقامات زمخشری، سبع معلّقات، ہمزیہ بوصیری، دیوان حماسہ وغیرہ

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی تأسیس

جب دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سے قطع تعلق کیا تو کراچی سے پشاور تک پاکستان کے دس بارہ سے زیادہ علمی اداروں نے صدر مدرس وغیرہ کے منصب پیش کیے لیکن کسی کو قبول نہ کیا اور باقی ماندہ تھوڑی سی عمر ادھر اُدھر ضائع کرنے اور نئے تجربات کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ سابقہ تجارب کی روشنی میں اپنے انداز کا دینی مدرسہ قائم کیا جائے اور وہاں اپنے طویل تعلیمی تجربہ کی روشنی میں طلبہ کی تعلیم وتربیت کا ایک خاص نظام رائج کیا جائے جونسل جدید کے لیے مفید ہو، لیکن ایسی عظیم الشان مہم کے لیے:

اوّلاً: اونچے درجے کے اخلاص کی حاجت۔

ثانیاً: ہمت بلند کی ضرورت۔

ثالثاً: جُہدِ مسلسل اور صبر واستقامت درکار۔

رابعاً: رفقاء کے روحانی ومادی تعاون کی احتیاج۔

مجھے احساس تھا کہ مجھے یہ چیزیں میسّر نہیں، اور ان کے بغیر کسی کام کی ابتداء خوابوں کی دُنیا بسانے اور ٹھنڈے لوہے پر چوٹ لگانے کے مرادف ہے:

﴿وَاَنّی لھم التناوش من مّکان بعید﴾ [سبا آیت ۵۲]

لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ حرمین شریفین کا سفر کروں، حج وزیارت کی سعادت حاصل کروں اور حج وزیارت کو ایسے کام کی توفیق کا ذریعہ بناؤں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کو محبوب ہو، اور وہاں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کروں کہ میرے دل میں وہ کام ڈالے جو دین وعلم کی خدمت کے سلسلہ میں میرے مناسب حال ہو۔

چنانچہ بروز جمعہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کو ہوائی جہاز سے بصرہ گیا اور وہاں سے عراقی طیارہ سے جدّہ اُترا اور مکہ مکرمہ پہنچا، ان مقدس مقامات میں، قبولیت دُعاء کے خصوصی مقامات و مبارک اوقات اور خاص کیفیت کی گھڑیوں میں اس مقصد وحید کے لیے خوب دعائیں مانگتا رہا، مکہ مکرمہ میں بیس روز گذار کر زیارت روضۂ نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ و السلام) کی غرض سے مدینہ منورہ روانہ ہوا، وہاں بتیس ۳۲ دن قیام رہا اور استخارہ و استشارہ کے بعد پختہ ارادہ کرلیا کہ دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سے مستعفی ہوکر نئے مدرسہ کی بنیاد ڈالوں گا اور اسے ایک خاص نہج پر چلاؤں گا۔

پاکستان واپس پہنچا تو حیران تھا کہ کیا کروں اور کیسے کروں؟ تقریباً سال بھر اسی شش و پنج میں گزرا، اس اثناء میں ایک صاحب ثروت حاجی یوسف سیٹھی (جنہوں نے اپنی دولت قرآن کریم اور دینی تعلیم عام کرنے کے لیے وقف کررکھی تھی) آئے اور تقریباً پچاس ہزار روپے مجھے پیش کرنا چاہے (جو میرے اور مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری کے لیے تقریباً پانچ سال کے مشاہرہ کے لیے کافی ہوتے) تاکہ ہم نئے مدرسہ کا افتتاح کردیں، لیکن میں نے یہ کہہ کر وہ خطیر رقم واپس کردی کہ میں متعدّد وجوہ کی بناء پر مدرسہ کی بنیاد رکھنے سے قبل کسی قسم کی امداد و معاونت قبول نہیں کرسکتا، ہاں مدرسہ کے افتتاح کے بعد جو معاونت ہوگی شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی، لیکن میں جتنا انکار کرتا رہا وہ اتنا ہی اصرار کرتے رہے، تاہم میں نے اس معاونت کے قبول کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

بعدازاں اپنے ایک دوست کی رفاقت میں مدرسہ کھولنے کا اِرادہ کیا، اس سلسلہ میں بعض ان حضرات کی معرفت جو حکومت میں اثر رکھتے تھے، حکومت سے مطالبہ کیا کہ مدرسہ کی تعمیر کے لیے ہمیں کوئی جگہ دی جائے، حکومت نے کراچی شہر سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں ''حب ندی'' کے قریب ''لال جبوہ'' نامی مقام پر دس ایکڑ زمین دینے پر رضامندی ظاہر کردی، مادی وسائل کی قلت، حصول کتب، طلبہ کے

وظائف، مدرسین حضرات کی تنخواہوں وغیرہ کی درپیش مشکلات کے سبب ابھی میں تردّد ہی میں تھا کہ اس جگہ کام شروع کروں یا نہیں کہ اخبارات میں میری طرف سے یہ اعلان شائع ہو گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے تخصص و تکمیل کے درجہ کے لیے ایک مرکز کا افتتاح کیا جا رہا ہے جس کا طرزِ تعلیم اور نصاب تعلیم یہ ہوگا:

۱-مشکلاتِ قرآن کی تعلیم۔

۲-مشکلات حدیث کا درس۔

۳-فقہاء کے مذاہب کا مقارنہ ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد کے طرز پر۔

۴-مقدمہ ابن خلدون کی تعلیم۔

۵-حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا پہلا جز۔

۶-تاریخ ادب عربی کے سلسلہ میں ''تاریخ ادب عربی'' اور ''الوسیط''

۷-تحریر و انشاء اور عربی لکھنے بولنے کی مشق اور اس کے لیے موضوع سے متعلق کتابوں کا یاد کرنا، مثلاً ابن الأجدابی کی "كفاية المتحفظ"، اُسکافی کی "مبادئ اللغة العربية"، ہمدانی کی "الألفاظ الكتابيه" اَبومنصور ثعالبی کی "فقه اللغة" وغیرہ۔

یہ اعلان ہوتے ہی دس بارہ فارغ التحصیل طلباء میرے پاس پہنچ گئے، جن میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے فضلاء بھی تھے، اکثریت ان طلبہ کی تھی جو پاکستان کے مدارس سے سند یافتہ تھے، اب میں طلبہ کے لیے کتابیں خریدنے اور ان کو وظیفہ دینے پر مجبور تھا، اس وقت میرے پاس میرے ایک فاضل دوست کے بارہ سو روپے امانت تھے، میں نے ان سے وہ قرض لے کر ضروری کتابیں جو میسّر آسکتی تھیں خرید لیں۔

جس رفیق کے ساتھ مل کر میں نے اس کام کو شروع کیا تھا وہ اپنے مخلص احباب و رفقاء سے چندہ وغیرہ جمع کرنے لگے اور میں نے عملی کام شروع کر دیا، ساتھ ہی اپنے احباب کو طلبہ کی معاونت اور ضروری اسباب مہیّا کرنے کی طرف متوجہ کرتا رہا، لیکن جلد ہی

مجھے احساس ہُوا کہ میں اپنے اس رفیق کے ساتھ رہتے ہوئے صحیح کام نہیں کرسکتا اور طلبہ کی جس طرح دینی وعلمی، اخلاقی وعملی تربیت کرنا چاہتا ہوں وہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے نہیں ہوسکتی، میرا ذوق اور خیالات ان صاحب سے مختلف تھے، ساتھ ہی کچھ اور حوادث اور تکلیف دہ واقعات بھی پیش آئے جن کا تذکرہ بے سُود ہے مجھے اُمید ہے کہ خدا مجھے اس کا صلہ آخرت میں دے گا۔

اس صورت حال کے پیش نظر میں ان سے قطع تعلق کرنے اور اس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا اور اب میں نے یہ کوشش کی کہ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر وہاں کام شروع کروں اور اپنے طرز کا مدرسہ کھولوں، اس کام کے لئے جامع مسجد نیو ٹاؤن، جس کی تعمیر ابھی شروع ہی ہوئی تھی مجھے پسند آئی، جامع مسجد کے ساتھ ہی ایک ٹکڑا فارغ پڑا تھا، منتظمین مسجد کا خیال تھا کہ جامع مسجد کی تعمیر سے فراغت کے بعد کبھی خدا نے موقع دیا تو وہاں پر مدرسہ بنائیں گے، میں نے مسجد کے سیکرٹری جناب محمد سلیم صدیقی لکھنویؒ اور خزانچی حاجی محمد یعقوب کالیہؒ کو یہ پیشکش کی کہ جس مدرسہ کو وہ ایک مدّت کے بعد بنانا چاہتے ہیں اس کو میرے حوالہ کردیں اور میں نے صاف الفاظ میں انھیں بتلا دیا کہ میں آپ حضرات سے کسی قسم کی معاونت کا خواہاں نہ ہوں گا، نہ تعمیر کے سلسلہ میں نہ کتابوں اور طلبہ کے وظائف وغیرہ کے سلسلہ میں، آپ حضرات صرف اتنا احسان کریں کہ اس فارغ قطعۂ اراضی سے مجھے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دیں، کمیٹی میں اس وقت مخلص قسم کے تاجر پیشہ لوگ تھے، جن میں حاجی وجیہ الدین دہلوی رحمہ اللہ جیسے سمجھدار تجربہ کار، مخلص اور نیک لوگ موجود تھے جنھوں نے مسجد کی تعمیر اور دینی مدرسہ اور دارالمطالعہ کے قیام کے لیے حکومت سے تین سال مقدمہ لڑکر یہ زمین حاصل کی تھی، کمیٹی کے سب اراکین نے متفقہ طور پر مدرسہ کا انتظام وانصرام اور دیگر تمام معاملات میرے سپرد کردیے۔

جب میں اس جامع مسجد میں پہنچا تو ابھی اس کا سنگ بُنیاد ہی رکھا گیا تھا وہاں

وضو خانہ تھا نہ استنجا خانہ، رہنے کا مکان تھا نہ رہنے کے قابل کوئی جگہ، نہ ضروریاتِ زندگی کا کوئی وجود تھا، ادھر میں بالکل خالی ہاتھ تھا، میرے پاس کچھ بھی نہ تھا، مجبوراً مجھے ایک تاجر حاجی علیم الدین صاحب جے پوری سے تین سو روپے قرض لینا پڑے اور ان میں سے تیس روپیہ فی طالبعلم کے حساب سے طلبہ کو ایک ماہ کا وظیفہ تقسیم کر دیا، اس طرح سے ۱۹۵۳ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی، اور یوں کام کی ابتداء محض اللہ جلّ شانہ کے توکّل اور بھروسہ پر ہوئی اور خدا کا شکر ہے کہ اس دینی و علمی کام میں خدا کے بھروسہ و اعتماد پر کام شروع کر کے مجھے اللہ کی متوکل بندوں سے مشابہت کا موقعہ میسّر آ گیا اگرچہ میں ان میں سے ہُوں نہیں۔

یہ تھی ابتداء کار اس راستہ میں جو مصائب و آلام، تکالیف اور مشقتیں اٹھانا پڑیں اور افکار کے جن پگھلا دینے والے ہجوم سے گزرنا پڑا ان کا تذکرہ بے معنی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ جیسے کمزور شخص کو توفیق و استقامت بخشی۔

فله الحمد كما ينبغى لجلال وجهه وعظيمه كبريائه وكبير منته والآئه

خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس مدرسہ کو اس کی نوعمری اور ابتداء ہی میں تعلیم و تربیت کی حسن۔ خوبی اور نظم و نسق کی عمدگی وغیرہ میں دوسرے مدارس و معاہد سے ممتاز کر دیا اور ابھی اس پر بیس سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس کے پاس عظیم الشان قیمتی کتب خانہ جس میں علوم و فنون کی کئی ہزار درسی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا جن کی قیمت کئی لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔

مدرسہ میں سر دست مندرجہ ذیل شعبہ جات کام کر رہے ہیں:

۱- درجہ حفظ و تجوید قرآن کریم، جس میں اس وقت سو سے زیادہ بچے پڑھتے ہیں۔

۲- مکتب و ناظرہ، جس میں تقریباً پچاس بچے پڑھتے ہیں۔

۳- درجہ اعدادی، جس میں عربی زبان، اردو لکھنا پڑھنا اور فارسی کی تعلیم دی

جاتی ہے۔تقریباً پچاس بچے داخل ہیں۔

۴-درجہ ثانویہ۔

۵-درجہ عالیہ۔

۶-درجہ تخصص فی الحدیث، اس میں حدیث اور اس سے متعلق علوم، اسماء الرجال، اصولِ حدیث، جرح وتعدیل، حدیثی مشکلات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، اس درجہ کے لیے طلبہ کے امتخاب کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وفاق المدارس العربیۃ الاسلامیہ کے دورہ کے امتحان میں شریک ہونے والے پانچ چھ سو طلباء اوّل درجہ میں کامیاب ہوتے ہیں ان میں سے پانچ طلباء کو منتخب کرلیا جاتا ہے، یہ طلباء اپنے مشرف ونگران (جو اس فن میں ماہر وعلاّمہ ہوتے ہیں) کی زیرِ نگرانی مقررہ نصاب کی کتابیں مطالعہ کرتے ہیں، چنانچہ صرف اصولِ حدیث میں دس کتابیں مطالعہ کرائی جاتی ہیں، حاکم کی "علوم الحدیث" خطیب کی "الکفایۃ" ابن الصلاح کی "علوم الحدیث" (یعنی مقدمہ ابن الصلاح) سیوطی کی "تدریب الراوی" جزائری کی "توجیہ النظر" وغیرہ وغیرہ ان کتابوں کے مطالعہ کے لیے طلبہ کو صرف تین ماہ کا عرصہ دیا جاتا ہے اور سہ ماہی پر ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔

پھر دوسری سہ ماہی میں اسماء الرجال کی کتابیں مطالعہ کرتے ہیں جن میں ''تھذیب التھذیب، میزان الاعتدال، لسان المیزان" وغیرہ شامل ہیں، ان کتب میں بھی امتحان لیا جاتا ہے پھر ان سے حدیث کی شروح "فتح الباری" مکمل اور "عمدۃ القاری" کے کچھ اجزاء کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اس میں امتحان ہوتا ہے اور آخر میں انھیں حدیث وعلم حدیث سے متعلق کوئی موضوع دے دیا جاتا ہے جس پر مقالہ لکھ کر پیش کرتے ہیں اور حسبِ مقالہ تخصص فی الحدیث کی سند دی جاتی ہے۔

۷-درجہ تخصص فی الفقہ الاسلامی بھی درجہ تخصص فی الحدیث کے طرز پر قائم ہے

جس میں "بدائع الصنائع"، "ردالمختار" جامع الفصولین"، "شرح الاشباه والنظائر" جیسی اہم کتابیں مطالعہ کرائی جاتی ہیں، ساتھ ہی قضاء وافتاء کی تربیت بھی دی جاتی ہے اور پیش آمدہ مسائل وحالات پر مقالات لکھائے جاتے ہیں، مقالہ پر حسب درجہ سند دی جاتی ہے۔

۸- ارادہ ہے کہ گنجائش اور حالات کو دیکھتے ہوئے آئندہ کچھ اور تخصصات شروع کئے جائیں مثلاً:

(ا) تحضص فی علوم القرآن ومشکلاته.

(ب) تحضص فی علم الکلام والتوحید والفلسفة.

(ج) تحضص فی الادب واللغة.

(د) تحضص فی التاریخ الاسلامی.

(هـ) التحضص فی العلوم العصریة من الاقتصاد والمعیشة و السیاسة والاجتماع وعلوم الطبیعة الحدیثه.

خدا سے دعا ہے کہ توفیق وہمّت دے۔

۹- ارادہ ہے کہ جلد ہی تخصص دعوت وارشاد کا شعبہ قائم کردیا جائے، جس میں دیگر کتب کے علاوہ انگریزی کی بھی تعلیم دی جائے گی۔

۱۰- دارالافتاء: جس میں چار مفتیانِ کرام کام کرتے ہیں، ملک کے گوشوں سے آنے والے فتاوٰی کے علاوہ اطرافِ عالم سے آنے والے فتاوٰی کے جوابات باقاعدہ دیئے جاتے ہیں۔

۱۱- شعبہ ''بیّنات'': ماہنامہ بیّنات کراچی کے نام سے ایک مجلّہ جاری ہے جس نے دین اسلام کی مدافعت اور ہر قسم کے الحاد وزندقہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو واقعی ''بیّنات'' ثابت کردکھایا ہے۔

مدرسہ میں طلبہ کی ضروریات کے لیے درج ذیل چیزیں موجود ہیں:

مطبخ، کھانے کا مطعم، ٹھنڈے پانی کے کولر، صاف ستھرے کمرے، بیماروں کے لیے علاج کی سہولت، بوقتِ ضرورت ان کو اسپتال میں داخل کرنا، ناشتہ کے لئے ماہوار وظیفہ، یہ سب چیزیں اس مدرسہ کی خصوصیات ہیں۔

مدرسہ کے تمام اخراجات ملک کے مخلص حضرات کی اعانت سے پورے ہوتے ہیں جس کے لیے نہ اخبارات میں اعلان ہوتا ہے، نہ چندہ کی اپیل، نہ سالانہ جلسوں کا انعقاد نہ سفراء بھیجے جاتے ہیں نہ حکومت سے امداد اور اوقاف سے معاونت طلب کی جاتی ہے، الحمدللہ تمام ضروریات پوری ہورہی ہیں، اس لیے کہ ہمارا بھروسہ خدا کی ذات پر ہے اور خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہیں اور لوگوں کے دل اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ صاحبِ ثروت نیک وصالح بندوں کے دلوں کو مدرسہ کی طرف متوجہ کردیتا ہے اور وہ اسی طرح دیتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے کہ دائیں نے کیا دیا ہے۔

اللہ کے فضل وکرم سے مدرسہ کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- اساتذہ ومدرسین کی تنخواہیں صرف عطیّات اور غیر زکوٰۃ کے فنڈ سے دی جاتی ہیں، زکوٰۃ اور صدقات واجبہ اس میں ہرگز نہیں لگائے جاتے۔

۲- زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ صرف غریب طلباء میں تقسیم کئے جاتے ہیں، ان سے کسی صورت میں تنخواہوں کے لیے قرض بھی نہیں لیا جاتا، حیلۂ تملیک کے نام سے جو فقہی حیلہ ہمارے پاکستان کے مدارس میں عام طور سے رائج ہے ہم نے بالکلیہ ختم کردیا ہے۔

۳- ہر کام کے لیے ہم نے خاص فنڈ رکھا ہے، اس کام پر اسی فنڈ کے پیسے کو لگایا جاتا ہے چنانچہ تعمیرات کے لیے جو پیسہ آئے گا وہ اسی میں خرچ ہوگا، جو پیسہ کتابیں خریدنے کے لیے لیا جائے اسے صرف کتابیں خریدنے پر، لحاف، گدّے، لباس وپوشاک کے پیسے صرف اسی کام میں، بجلی پنکھے وغیرہ کے لیے آمدہ پیسے صرف بجلی پنکھے پر ہی خرچ

ہوں گے، ایک فنڈ کا پیسہ دوسرے فنڈ میں خرچ نہیں کیا جائے گا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ان خصوصیات پر ثابت قدم رکھنے کی توفیق بخشی، امید ہے کہ مدرسہ تا حیات اس پر عامل رہے گا، خدا سے دعا ہے کہ ہمیں اس پر دائم وقائم رکھے، یہ خدا تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ جس کا زبان سے شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔

ذلك فضل الله علينا وعلى النّاس ولكنّ أكثر النّاس لا يشكرون

مدرسہ عربیہ اسلامیہ اس وقت مغربی ومشرقی پاکستان کی ممتاز دینی درس گاہ ہے اور میں بحیثیت مدیر اور شیخ الحدیث کے خدمات انجام دے رہا ہوں۔

اس درمیان کراچی یونیورسٹی کی طرف سے انتخاب اساتذہ کمیٹی کا رکن رہا، جس کے کل تین ممبر ہوتے ہیں، اپنے مشاغل کی وجہ سے معذور تھا اس لیے ایک سال بعد استعفیٰ پیش کیا مگر اب تک منظور نہیں ہوا۔ قاہرہ کی مجمع ''البحوث الاسلامیہ'' کی کانفرنس میں شرکت کرتا رہا، جمہوریہ سوریہ کی اکیڈمی ''المجمع العلمی العربی'' کا پاکستان کی طرف سے ممبر ہوں اسی طرح مجمع البحوث الاسلامیہ کا رکن اور مجلس علمی کراچی کا اعزازی نگرانِ اعلیٰ ہوں، تقریباً اڑتیس سال سے تدریسی خدمات میں مشغول ہوں، الحمدللہ ہر سال ''صحیح بخاری'' زیرِ درس رہتی ہے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کا امیر ہوں اور فتنۂ قادیانیت اور اس کے علاوہ دوسرے فتنوں (فتنۂ پرویزیت وڈاکٹر فضل الرحمٰن وغیرہ) کی مکافحت واستیصال اور اسلام کی طرف سے مدافعت کا اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے بہترین موقعہ دیا۔

فله الحمد الجزيل والشكر العزيز، وصلّى الله علىٰ
خير خلقه سيدنا محمد وآله وصحبه وبارك وسلّم

۱۳۹۶/۱/۲۴ھ
۱۹۷۶/۲/۲۷ء

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری



تاریخ و مقام پیدائش

بانی جامعہ علوم اسلامیہ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ بروز جمعرات ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء ضلع مردان میں شیخ ملتون ٹاؤن کے مشرق میں واقع ''مہابت آباد'' نامی بستی میں بوقت سحر پیدا ہوئے۔

نام ونسب

آپ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت سید آدم بنوری رحمہ اللہ کی اولاد میں سے تھے، سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے: سید محمد یوسف بن محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بن میر موسیٰ بن غلام حبیب بن رحمت اللہ بن عبد الاحد بن حضرت محمد اولیاء بن سید محمد آدم بنوری، سلسلۂ نسب نویں جدِ امجد عارف محقق حضرت سید آدم بنوری کی وساطت سے حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔

مقام بنور

ہندوستان کی ریاست پٹیالہ میں سرہند کے قریب ایک قصبہ ہے، اس مقام

بنور (با کے زبر اور نون کے پیش کے ساتھ) کی نسبت سے آپ کے جد امجد سید آدم بنوری کہلاتے تھے، اس لیے ان کی اولاد بنوری کہلانے لگی، سید آدم بنوری رحمہ اللہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اللہ تعالی نے حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارناموں کا وافر حصہ حضرت سید آدم بنوری رحمہ اللہ کو بھی عطا فرمایا تھا جو ورثہ میں منتقل ہوتے ہوئے حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تک آپہنچا، چنانچہ اللہ تعالی نے حضرت سے اپنے دور میں عظیم اصلاحی وتجدیدی کام لیے جن کا ذکر عنقریب آجائیگا۔

ہندوستان میں سکھوں کے غلبہ کے دور میں حضرت سید آدم بنوری رحمہ اللہ کے خاندان کے کچھ لوگ سرحد آکر آباد ہوگئے، آپ کے پردادا میر احمد شاہ بڑے وجیہہ بزرگ تھے، انہوں نے پشاور میں ایک محلہ آباد کیا جوان کے نام پر گڑھی میر احمد شاہ کے نام سے معروف ہے، آپ کے خاندان کے بیشتر لوگ یہیں آباد ہیں جبکہ بعض کوہاٹ وغیرہ کی طرف منتقل ہوگئے ہیں۔

آپ کے والد ماجد مولانا سید محمد زکریا بنوری رحمہ اللہ جید اور پختہ عالم ہونے کے علاوہ حاذق طبیب، تعبیر رؤیا کے امام اور صاحب حال بزرگ تھے، آپ نے عربی اردو دونوں زبانوں میں نہایت قیمتی اور علمی کتابیں لکھیں، جو موضوع کے ساتھ ساتھ تحقیق میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔

آغاز تعلیم

قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجدؒ اور ماموں مولانا فضل صمدانی بنوریؒ سے اپنے گھر پر گڑھی میر احمد شاہ پشاور میں حاصل کی، صرف ونحو اور دیگر فنون کی ابتدائی کتابیں شیخ مولانا حافظ عبد اللہ شہیدؒ بن خیر اللہ پشاوری متوفی ۱۳۴۰ھ کے پاس گاؤں ارباب لنڈی پشاور میں پڑھیں، پھر امیر حبیب اللہ خان کے دور میں کابل (افغانستان) کے ایک مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، فقہ، اصول فقہ، منطق ادب، بیان اور

دیگر علوم وفنون کی متوسط کتابیں پشاور اور کابل کے علماء سے پڑھیں، آپ کے اس دور کے اساتذہ میں قاضی القضاۃ مولانا عبد القدیرؒ افغانی لقانی (افغانستان جلال آباد کے محکمۂ شرعیہ کے قاضی مرافعہ) اور شیخ محمد صالح القیلغوی افغانی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ،قاضی عبد القدیر صاحبؒ سے آپ نے میر زاہد، ملا جلال، کنز ثانی، ہدایہ اخیرین اور بعض دوسری کتابیں بھی پڑھیں۔

دارالعلوم دیوبند روانگی

کابل سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور باقی ماندہ علوم وفنون کی کتابیں علماء دیوبند سے پڑھیں، چنانچہ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۴۷ھ تک دارالعلوم دیوبند میں طالب علم رہے، اور وہاں امام العصر محدث جلیل حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ آپ کے اجلہ مشائخ میں سے تھے۔

سند فراغت

حوادث ایام اور ابتلا آت زمانہ کی وجہ سے جب مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل منتقل ہوگئے تو حضرت بنوری رحمہ اللہ بھی اپنے ان اساتذہ کے ساتھ ڈابھیل چلے آئے اور پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے ہی ۱۳۴۷ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

کمالات انوری کا عکس

دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے کسی کو علم کے حقیقی ثمرات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے کسی مرد کامل کی صحبت بھی از حد ضروری ہے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کو بھی اللہ نے جو بلند مقام نصیب فرمایا وہ ان کی ذہانت وذکاوت اور علمی استعداد سے زیادہ حضرت کشمیریؒ کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا، دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد آپ

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ ہی کی خدمت میں مستقل رہ پڑے اور شب و روز کی مصاحبت میں کمالات انوری سے بھر پور استفادہ کیا، حضرت کشمیری رحمہ اللہ آپ کے خصوصی اور سب سے بڑے شیخ تھے اور حضرت بنوری رحمہ اللہ اپنے شیخ کے سچے عاشق اور محبّ صادق تھے، ان کی ایک ایک ادا کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا، ان کی محبت سے آخر دم تک سرشار رہے اور کسی نہ کسی مناسبت سے اس والہانہ انداز سے ان کا ذکر خیر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اپنے شیخ سے مل کر آرہے ہیں، ان کے ملفوظات ایسے محفوظ کر رکھے تھے کہ ہو بہو انہیں الفاظ میں بیان کرتے تھے، ان کے ذکر خیر کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر لفظ وحرف سے محبت وعقیدت کا چشمہ ابل رہا ہے، حضرت بنوریؒ ویسے تو اپنے تمام اساتذۂ کرام کے منظور نظر تھے لیکن امام العصر حضرت علامہ شاہ صاحب کشمیریؒ سے آپ کو جو خصوصی تعلق رہا اس کی مثال شاید حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے تلامذہ میں نہ ملے، آپ نے امام العصرؒ سے ہی اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کئے اور سب سے زیادہ فیض یاب ہوئے، سفر وحضر میں ان کے خادم اور ایک سال سے زیادہ عرصہ تک شب و روز ہمہ دم ان کے رفیق رہے، شیخ نے ان کی جانفشانی، لگن، محبت، عقیدت اور خدمت کو دیکھ کر اتنا اثر لیا کہ آپ کو اپنے ساتھ ملحق کرلیا اور ۱۳۴۸ھ میں آپ کو اپنے ساتھ کشمیر لے گئے، آپ چوبیس گھنٹے میں دو گھنٹے آرام کرتے اور بقیہ سارا وقت اپنے شیخ کی خدمت اور ان سے علوم کے اخذ و اکتساب میں صرف کرتے، اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کا صلہ یہ دیا کہ آپ کو بھی اپنے شیخ کے رنگ میں رنگ دیا اور بے نظیر محدث، بے بدل عالم، جلیل القدر محقق، بلند پایہ فقیہ، اعلیٰ درجے کا مفسر اور اونچے درجے کا ادیب وشاعر بنادیا، اس سفر کے بعد حضرت بنوریؒ اپنے وطن پشاور چلے گئے اور وہیں اقامت کی۔

عملی زندگی

فراغت کے بعد ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں اپنے والد ماجد رحمہ اللہ کے اصرار و

خواہش پر ایک ماہ کی قلیل مدت میں تیاری کر کے امتیازی نمبروں کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، اسی درمیان آپ چار سال تک پشاور میں جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر سیاسی و دینی خدمات انجام دیتے رہے اور جمعیت علماء اسلام پشاور کے صدر بنادیے گئے، چونکہ آپ کی طبیعت کا خمیر علم و دانش کی بنیاد پر گوندھا گیا تھا اس لئے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت بنوریؒ نے سیاست سے عملی طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی، بعد میں اپنی جوانی کے اس قیمتی وقت کے سیاست کے نذر ہونے پر افسوس کا اظہار فرمایا کرتے تھے، پشاور کے قیام کے دوران آپ مدرسہ رفیع الاسلام بھانہ ماڑی میں تدریس کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس اور مجلس علمی کی طرف سے عالم عرب کا سفر

علامہ کشمیریؒ کی بے لوث خدمت ہی کا صلہ تھا کہ شیخ کی وفات کے بعد حضرت بنوری اپنے شیخ کے لگائے ہوئے باغ کے رکھوالے بنے اور ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ کا شیخ الحدیث وصدر مدرس بننے کا شرف حاصل ہوا، نیز جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مجلس علمی نے آپ کو مجلس کا باقاعدہ رکن بنایا اور ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں اپنی بعض کتب کی طباعت کے سلسلہ میں قاہرہ بھیجا، آپ کی زیرنگرانی "نصب الرایہ"، "فیض الباری" اور "بغية الاريب" جیسی بلند پایہ علمی و تحقیقی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، جن کے حسن طباعت کی آج بھی دنیا داد دینے پر مجبور ہے، تینوں کتابوں کی طباعت ایسے عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب ٹائپ پر کروائی کہ ہندوستان کے لوگ اس زمانہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ان کی طباعت پر حضرت نے بڑی محنت کی، طباعت کے سلسلے میں یہ آپ کا پہلا تجربہ تھا، لیکن قدرت نے آپ کو ہر فن میں بہت اونچا ذوق عطا فرمایا تھا، چنانچہ مصر پہنچنے کے بعد آپ نے مختلف مطابع سے رابطہ قائم کیا اور مذکورہ بالا کتابوں کے لیے ان کا

سائز کاغذ اور حروف کا تعین فرمایا، اور کئی روز کی جدوجہد کے بعد ایک ایسا مطبعہ ان کو مل گیا جو ان کی شرائط اور ذوق کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہوگیا، طباعت سے پہلے کتاب "نصب الرایه" کی تصحیح کے سلسلہ میں آپ نے بہت محنت فرمائی، چونکہ یہ سفر حج سے شروع ہوا تھا اس لیے حج کے بعد حرمین شریفین میں مختلف دو کتب خانوں میں "نصب الراية" کے قلمی نسخوں سے اپنے نسخے کا مقابلہ فرمایا اور جب مصر پہنچے تو "دار الكتب المصرية" میں دو نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا جس کی تفصیل نصب الرایۃ کے مقدمہ میں "نصب الراية والعناية بحاشية والعناء في تصحيحه وطبعه" کے عنوان سے پیش کی ہے۔

دیوبند و اکابر دیوبند کا بلاد عرب میں تعارف

حضرت بنوریؒ نے علمائے ازہر اور دیگر علمائے مصر کو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ اکابر دیوبند کے علمی مقام سے متعارف کرایا اور ان کی گرانقدر تصنیفات اور ان کی علمی و دینی اور ملی و سیاسی خدمات سے آگاہ کیا، اس سلسلے میں آپ کے مختلف مضامین مصر کے ہفت روزہ ''الاسلام'' میں قسط وار شائع ہوئے جن میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کے علمی، دینی، اصلاحی اور سیاسی کارنامے پیش کیے، اسی سفر میں مصر، یونان، ترکی اور حجاز مقدس کا سفر کیا اور مفوضہ علمی خدمت کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا، آپ تقریباً ایک سال ملک سے باہر رہے، اس سفر میں آپ کی علامہ طنطاوی، علامہ زاہد الکوثری، شیخ خلیل خالدی مقدسی، شیخ عمران بن حمدان محرسی مالکی مغربی، شیخ محمد بن حبیب اللہ بن مایابی جکنی شنقیطی اور شیخ یوسف دجوی سے بھی ملاقات ہوئی۔

اسی دوران ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں قاہرہ میں فلسطین کے بارے میں علماء اسلام کی ایک کانفرنس بلائی گئی تو متحدہ ہندوستان سے مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ مصر تشریف لے گئے، مفتی اعظم ہند چونکہ خود علیل تھے اس لیے انہوں نے

حضرت بنوریؒ کو اپنا نائب بنایا، چنانچہ آپ نے مفتی اعظم ہند کی طرف سے تمام فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

طبع شدہ کتابوں کا ذخیرہ ساتھ لے کر آپ واپس ڈابھیل آئے تو ڈابھیل میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دونوں بزرگوں کی مسند حدیث کے وارث ہوئے، آپ کی علمی شہرت اس زمانے میں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی، آپ نے مدرسہ کے شیخ الحدیث کی مسند کو زینت بخشی، بخاری، ترمذی اور ابوداود کا درس آپ کو تفویض کیا گیا، تقسیم ملک تک آپ اسی منصب پر فائز رہے۔

ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے طبقہ علیا کی مدرسی کی بار بار پیشکش کی گئی لیکن آپ نے معذرت کر دی، دارالعلوم دیوبند کے منصب افتاء کے لیے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ اور مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تینوں حضرات نے اصرار فرمایا لیکن انکار کر دیا، جامعہ احمدیہ بھوپال کے شیخ الحدیث کے عہدہ کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے دعوت دی لیکن قبول نہ فرمائی، اس کا سبب غالبا یہ تھا کہ آپ ڈابھیل کے مدرسہ کو اپنے شیخ رحمہ اللہ کی امانت سمجھتے تھے اور اس سے مفارقت آپ کو گوارا نہ تھی۔

پاکستان آمد اور دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں تدریس

حضرت بنوریؒ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا، تقسیم کے بعد مشکل یہ پیش آئی کہ جس خطہ میں پاکستان بنا، وہاں مدرسے نہ تھے اور جہاں دینی درس گاہیں تھیں وہاں سے مسلمانوں کی اکثریت نے ہجرت کر لی تھی، اس لیے ڈابھیل میں حلقہ درس نہیں رہا تھا، چنانچہ پہلے تو مولانا بنوری کو دارالعلوم دیوبند آنے کی دعوت دی گئی مگر چونکہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مولانا بنوری کے مداح اور ان کے کمالات کے قدر شناس تھے اس لیے مولانا کو پاکستان منتقل کرانے کے مشورے شروع ہوئے، ٹنڈو اللہ یار میں دوسرا ''دارالعلوم دیوبند''

بنانے کا منصوبہ تھا اور اس مقصد کے لیے چوٹی کے علماء کو جمع کیا جارہا تھا، اسی سلسلے میں مولانا بنوری کو بھی پاکستان آنے کی دعوت دی گئی اور ۱۳۶۸ھ میں دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار میں ''شیخ التفسیر'' کے منصب پر آپ کا تقرر کیا گیا لیکن پھر کچھ ہی عرصے بعد بعض مصالح کی وجہ سے آپ کو دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار سے سبکدوشی اختیار کرنا پڑی۔

نئے ادارے کا قیام اور اس کے لیے کوششیں

آپ نے جب دارالعلوم سے ترک تعلق کیا تو کراچی سے پشاور تک پاکستان کے دسیوں علمی مراکز سے دعوت نامے موصول ہوئے اور اعلیٰ مناصب کی پیشکش کی گئی لیکن یہی طے کیا کہ بقیہ تھوڑی سی زندگی ادھر ادھر ضائع کرنے اور نئے تجربات کے بجائے اپنے طرز کے ادارہ کے قائم کرنے پر صرف کرنا چاہیے، ساتھ ہی یہ بھی سوچتے تھے کہ اس قسم کے عظیم الشان کام جس اخلاص، بلند ہمتی، جہد مسلسل، صبر و استقامت، رفقاء کار کی روحانی و مادی معاونت کے محتاج ہوتے ہیں، یہ تمام امور مجھے میسر نہیں اس لیے ضروری سمجھا کہ خود اسی ذات سے مدد مانگی جائے جس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں اور اس کے لیے اس ذات کو شفیع بنایا جائے جسے رحمۃ للعالمین فرمایا گیا ہے اور جن سے تعلق و وابستگی رحمت الٰہی کی جاذب ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ و زیارت مدینہ منورہ کو اپنے ''سفر جدید'' کے لیے ذریعہ بنایا تاکہ استخارہ اور استشارہ کے ذریعہ جو مناسب معلوم ہو اس پر عمل پیرا ہوں، اس مقصد کے لیے ۴ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ کو آپ ہوائی جہاز سے بصرہ گئے اور وہاں سے عراقی ائیر لائن کے ذریعہ جدہ پہنچے، مقدس مقامات اور دعاؤں کی قبولیت کی جگہوں پر، قبولیت کے مخصوص حالات و اوقات میں اسی مقصد وحید کے لیے خصوصی دعائیں کرتے رہے، بیس روز تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا، مکہ مکرمہ کے اس قیام میں خود بھی سراپا فقیر بن کر بارگاہ رب العزت میں دعاء و ابتہال میں مشغول رہے اور وہاں کے ارباب قلوب، اصحاب باطن اور اہل اللہ

سے خصوصی روابط قائم کیے اور ان سے بھی عقدہ کشائی کے لیے استخاروں اور دعاؤں کی فرمائش کی، معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آپ پر سپردگی اور تفویض کی خاص حالت طاری تھی اور جس طرح ایک بے اختیار غلام اپنے مالک کے چشم و آبرو کا منتظر رہتا ہے، کسی کام میں وہ اپنی رائے سے قدم نہیں اٹھاتا، اسی طرح آپ بھی چاہتے تھے کہ بارگاہ ربوبیت سے آپ کو کوئی مشورہ ملے، مکہ مکرمہ سے روضۂ اقدس (علی صاحبہا الف الف تحیۃ) پر حاضری دینے کے لیے روانہ ہوئے، مدینہ طیبہ میں بتیس (۳۲) روز قیام رہا، یہاں بھی دعاؤں اور استخاروں کا وہی سلسلہ رہا، حضرت شیخ رحمہ اللہ پر ان دنوں بے قراری و بے کسی کی عجیب کیفیت طاری تھی، آپ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا انہیں دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں رہنا چاہیے یا اپنا مستقل ادارہ قائم کرنا چاہیے اور یہ کہ کیا مدرسہ سے مشاہرہ لے کر تعلیم و تدریس کا کام کریں یا طب وغیرہ کو ذریعہ معاش بنا کر بلا معاوضہ یہ خدمت بجالائیں، مسلسل دعاؤں، مشوروں اور استخاروں کے نتیجہ میں بالآخر آپ کی عقدہ کشائی ہوئی اور مکاشفات کے ذریعہ آپ کو رہنمائی ملی کہ ٹنڈو الہ یار کا مدرسہ چھوڑ کر اپنا مدرسہ قائم کریں، کوئی ذریعہ معاش نہ اپنائیں بلکہ مشاہرہ لے کر یکسوئی سے اپنے تمام اوقات تعلیم و تدریس اور دینی خدمات کے لیے وقف کر دیں۔

یہ صورت حال مدینہ منورہ میں قیام کے پندرہ روز بعد پیش آئی تھی، جب حضرت بنوری رحمہ اللہ واپس لوٹے تو فرماتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کروں ؟ کیسے کروں؟ تقریباً ایک سال تک اسی شش و پنج میں رہے، بالآخر حضرت نے ٹنڈو الہ یار سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنا ایک الگ مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ فرمایا، ایک صاحب جن کا نام مولانا محمد طفیل تھا انہوں نے اس وقت کراچی میں ایک دار التصنیف قائم کر رکھا تھا، موصوف نے مولانا بنوریؒ کو ترغیب دی کہ آپ جس طرح چاہیں مدرسہ بنائیں، مالی ضروریات کی کفالت میں کروں گا، مولانا نے ان کی رفاقت میں مدرسہ جاری کرنے کا

فیصلہ کرلیا، ''ہب ندی'' کے قریب ایک بستی ''لال جیوا'' میں ایک متروکہ ہندو دھرم سالہ مولانا طفیل کے زیر قبضہ تھا، وہاں پر مولانا بنوری نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا ، مادی وسائل کی قلت ، کتابوں کی حصولی میں دقتوں اور طلبہ کے وظائف ، اساتذہ کے مشاہرات کے حصول میں پیش آنے الی مشکلات کے سبب حضرت شیخ رحمہ اللہ ابھی کام کی ابتداء کے بارے میں متردد ہی تھے کہ آپ کی طرف سے اخبارات وجرائد میں یہ اعلان آ گیا کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے درجہ تخصص اور درجہ تکمیل کا افتتاح مذکورہ مدرسہ میں کردیا گیا ہے، یہ اعلان ہوتے ہی درس نظامی کے دس فارغ التحصیل طلباء حضرت بنوریؒ کے پاس پہنچ گئے ، جن میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور جیسے ہندوستان کے مشہور ومعروف مراکز علم کے طلبہ وفضلاء بھی تھے ، اس وقت صرف دو جماعتیں تھیں ، ایک دورہ حدیث کی اور ایک درجہ تکمیل کی ، مدرسہ میں چونکہ ابتداءً کچھ نہیں تھا اس لیے مولانا نے تعلیمی وتدریسی رفاقت کے لیے اپنے پرانے دوستوں کو دعوت دی اور لکھا کہ فی الحال مدرسہ میں تنخواہ کی گنجائش نہیں ہے، تو کلا علی اللہ کام کرنا ہوگا ، چنانچہ حضرت بنوریؒ کی دعوت پر تین اشخاص مولانا محمد یوسف مردانی ، مولانا لطف اللہ جہانگیروی اور مولانا عبدالحق نافع گل رحمہم اللہ نے لبیک کہی ، یہاں بے سروسامانی کا عالم تھا، ایک عمارت میں رہائش تھی، تنخواہ کی تو ابتداء ہی سے کوئی توقع نہ تھی لیکن سب سے بڑی مشکل طلبہ کے لیے خورد ونوش اور ضروریات زندگی کا سامان مہیا کرنا تھا، یہ ویرانہ کراچی سے خاصی دور تھا، وہاں کا پانی بڑا کڑوا تھا، پینے کا پانی بھی کراچی سے لانا پڑتا تھا، اس عمارت کے گرد وپیش غلاظت کے ڈھیر تھے، جہاں مکھیوں کا ہجوم رہتا تھا، درخت کے نیچے بیٹھ کر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا ،حضرت بنوریؒ کراچی جا کر طلبہ کے لیے خوراک کا سامان خود لاتے ، الغرض یہاں کا قیام ایسا تکلیف دہ تھا کہ اس کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں، یہ زمانہ مولانا کے صبر واستقامت کے امتحان کا تھا، ان دنوں مولانا مرحوم سراپا

بے کسی و بے چارگی کا مجسمہ تھے، انہوں نے ان حالات کا بڑی جانکاہی اور پامردی سے مقابلہ کیا، اسی دوران مولانا محمد یوسف مردانی اور مولانا عبدالحق نافع گل رحمہما اللہ واپس تشریف لے گئے اور حضرت بنوری اور مولانا لطف اللہ جہانگیروی رحمہما اللہ اکیلے رہ گئے، ابھی زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ آپ کو یہ احساس ہوا کہ جن صاحب کی رفاقت میں یہ کام شروع کیا تھا ان کے ساتھ شریک رہ کر اپنے مقصد کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا، نہ اپنی صوابدید کے مطابق طلباء کی علمی، اخلاقی، عملی، دینی اور دنیوی اعتبار سے صحیح تربیت کر سکوں گا، اس لیے کہ دونوں کے ذوق، طبیعت اور خیالات میں بہت فرق اور بُعد نکلا۔

مدرسہ کے لیے جگہ کا انتخاب

موجودہ صورت حال کے پیش نظر اس جگہ اور اس ساتھی کو خیر باد کہہ کر یہ فیصلہ ہوا کہ ان طلباء کو ساتھ لے کر یہاں کے بجائے مدرسہ کے لیے کوئی اور جگہ ڈھونڈی جائے ، اور یہ سوچا گیا کہ ملک کے دارالخلافہ کراچی میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر وہاں کام شروع کیا جائے اور اپنے طرز کے مدرسے کا آغاز کیا جائے ، اس مقصد کے لیے آپ نے مرکز ایسے مرکزی مقام پر قائم کرنے کا ارادہ فرمایا جہاں سے الحاد و بے دینی کے یہ فتنے پھوٹتے ہیں اور ملک میں پھیلتے ہیں تا کہ ان نو بنو فتنوں سے بروقت آگاہی آسان ہو اور ظاہر ہے کہ ایسے مرکز کے لیے کراچی سے زیادہ موزوں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اس کو ایک بین الاقوامی شہر کی حیثیت حاصل ہے، حضرت بنوری رحمہ اللہ نے بھی ''مدرسہ کی سہ سالی زندگی کا اجمالی خاکہ'' میں اسی جانب اشارہ فرمایا ہے:

> ''پاکستان کے مرکز کراچی میں جو آئے دن مغربی تہذیب و تمدن کا جو جال پھیلتا جا رہا ہے اور مختلف طاقتیں اس کے دائرہ اثر کو روز بروز وسیع کرنے کی فکر میں مشغول ہیں، اگر دینی حفاظت کے ادارے دین اسلام کے متاع گراں مایہ کی حفاظت

کے لیے جد و جہد نہ کریں تو جو اس کا حشر ہوگا وہ ظاہر ہے''۔

اس کام کے لیے جمشید روڈ پر ایک زیر تعمیر جامع مسجد کا انتخاب کیا گیا، حضرت بنوریؒ محض اللہ تعالی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے رفیق غربت اور یار غار مولانا لطف اللہ جہانگیروی رحمہ اللہ اور درجہ تکمیل کے دس طلباء کے ساتھ اس جامع مسجد میں منتقل ہو گئے ،مسجد کے ساتھ ہی زمین کا ایک قطعہ فارغ پڑا ہوا تھا، مسجد کے منتظمین اس جگہ پر مسجد مکمل کرنے کے بعد مدرسہ بنانا چاہتے تھے، ان حضرت کا خیال تھا کہ مسجد کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد جب خدا توفیق دے گا اس جگہ دینی مدرسہ بنایا جائے گا، حضرت بنوری رحمہ اللہ مسجد کے سیکریٹری محمد سلیم صدیقی لکھنوی اور خزانچی حاجی محمد یعقوب کالیہ دہلوی سے ملے ،اپنی تجویز پیش کی اور خواہش ظاہر کی کہ اس خطہ کو آپ کے حوالہ کر دیا جائے اور ان سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہمیں آپ سے کسی قسم کی مالی امداد و معاونت نہیں چاہیے، آپ حضرات پر کتابوں کی خرید بوجھ ہوگا نہ طلبہ کے وظائف کا، آپ صرف اتنا احسان کریں کہ اس خالی زمین کے ویران ٹکڑے کو آباد کرنے کی اجازت دے دیجیے، کمیٹی کے ارکان نے مدرسہ کے تمام معاملات اور نظم کا معاملہ متفقہ طور پر آپ کے سپرد کر دیا۔

جامعہ بنوری ٹاؤن کی ابتدائی حالت

حضرت بنوری رحمہ اللہ جب اس جامع مسجد میں پہنچے تو وہ بالکل ابتدائی حالات میں تھی، صرف سنگ بنیاد ہی رکھا گیا تھا، مسجد کے احاطہ میں صرف ٹین کی چھت کا ایک حجرہ تھا، اسی حجرہ میں حضرت بنوری اور مولانا لطف اللہ رحمہما اللہ نے اپنا مختصر سا سامان رکھ دیا اور رات کو سونے کے لیے اپنے ایک دیرینہ دوست کے گھر پر جو مدرسہ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہی تھا چلے جاتے تھے، اور مسجد میں ہی دن کو پڑھتے اور مسجد میں ہی رات کو سوتے اور اپنا سامان خورد ونوش اور ضروری سامان بھی مسجد میں ہی رکھتے، مسجد اس وقت قطعا غیر محفوظ اور ہر طرف سے کھلی ہوئی تھی، طلباء کے سامان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا،

وقتاً فوقتاً سامان چوری ہو جاتا تھا، اسی ضرورت کے تحت موجودہ حجرہ کی پختہ چھت اور اس کے ساتھ ہی طلبہ کے لیے دوسرے حجرے کی تعمیر کے لیے خود حضرت بنوری رحمہ اللہ اپنے دوستوں سے تین سو روپے لائے اور منتظمین کو دیے، اور اس طرح دوسرا حجرہ بنا، اسی طرح مسجد میں نہ وضو خانہ تھا، نہ جائے حاجت، غرض ضروریات زندگی کی کوئی خاطر خواہ سہولت موجود نہ تھی، اس بے سروسامانی کے عالم میں کہ نہ طلباء کے خورد ونوش کی ہی کوئی سبیل تھی نہ اساتذہ کو حق الخدمت دینے کا کوئی راستہ، اپنے ایک مخلص دوست سے آپ نے تین سو روپیہ قرض لے کر طلبہ کو تیس روپے ماہوار کے حساب سے ایک ماہ کا وظیفہ تقسیم کیا یوں ۱۹۵۳ء میں جامعہ علوم اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی، اور اس طرح سے اس مبارک کام کی ابتداء حضرت بنوری رحمہ اللہ کی حسب منشاء محض اللہ کے توکل اور بھروسہ پر ہوئی، حضرت بنوری رحمہ اللہ جامعہ کے آغاز کے بارے میں ''اجمالی خاکہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''بہت غور وخوض کے بعد انہی مقاصد دینیہ کے پیش نظر محض اللہ تعالی کی ذات پر بھروسہ کر کے ۳ محرم ۱۳۷۳ھ میں انتہائی بے سروسامانی میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا گیا، نہ رہنے کی جگہ تھی، نہ کتابیں تھیں، نہ الماریاں تھیں، نہ تپائی، نہ چٹائی، نہ طلبہ واساتذہ کے لیے آمدنی کا کوئی ذریعہ، نہ مجلس شوری تھی، نہ چندہ جمع کرنے کے لیے کوئی سفیر مقرر کیا گیا تھا، نہ اخبارات یا اشتہارات میں چندہ کی اپیل کی گئی، قرض پر ایک ہزار کی کتابیں خریدی گئیں، اور طلبہ کے مصارف کے لیے قرض رقم مہیا کی گئی، لیکن اللہ کا شکر ادا نہیں کر سکتا''۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ کے اخلاص وتعلق مع اللہ کی برکت سے قلیل عرصہ میں معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری محاسن میں بھی اوج کمال تک پہنچا، اب اللہ تعالی کا کرم

ہے اور حضرت بنوریؒ کے غلبۂ اخلاص کی برکت کا نتیجہ ہے کہ آج جامعہ کی شاندار عمارت موجود ہے اور اساتذہ وطلبہ کے لیے تمام ضروریات وسہولیات دستیاب ہیں، تحفیظ القرآن سے لے کر تخصصات تک کی تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام موجود ہے اور اللہ نے اس دینی مرکز کو حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے اخلاص کی برکت سے وہ مقبولیت عطا فرمائی کہ جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، جامعہ اپنے اسلاف اور اکابر کی روایات کے مطابق ایک طرف اشتہاری اور پروپیگنڈے کی دنیا سے کوسوں دور ہے تو دوسری طرف قبولیت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے تشنگانِ علم اور مغربی تہذیب وتمدن سے تنگ آئے ہوئے لوگ علم کے حصول اور قلبی تسکین پانے کے لیے آرہے ہیں، اگر ایک طرف ملک کے اطراف واکناف سے آئے ہوئے طلباء استفادہ کررہے ہیں تو دوسری طرف بیرون ملک کے کئی ممالک کے طلباء بھی طلب علم میں مصروف نظر آئیں گے، اور قلیل عرصہ میں ہزاروں علمائے کرام علوم دینیہ سے فارغ ہو کر ملک اور بیرون ملک خدمت دین میں مشغول ہیں ان میں تقریباً ساٹھ بیرونی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، جامعہ اور اس کے تمام شعبہ جات کی تفصیل آگے آپ ملاحظہ فرمالیں گے۔

حضرت بنوریؒ کی تصانیف

حضرت بنوری رحمہ اللہ کی اکثر تصانیف عربی میں ہیں جو عربی ادب کا شاہ کار ہیں، آپ کی تصانیف اہل عرب پڑھ کر حیرت میں رہ جاتے تھے کہ ایک غیر اہل لسان بھی اتنی اعلیٰ عربی لکھ سکتا ہے، آپ نے اپنی تمام تالیفات میں اسلوب تحریر بالکل اچھوتا ومنفرد رکھا تھا، دوسروں کی عبارتیں نقل کرنے کے بجائے اپنے الفاظ میں ان کا خلاصہ اس طرح نکالتے تھے کہ اصل عبارت سے کم جگہ میں اس شرط کے ساتھ کہ اس میں سے کچھ رہ بھی نہ جائے اور سمجھنے میں کوئی دقت بھی نہ ہو، آپ کی تالیفات درج ذیل ہیں:

۱- بغية الأريب في مسائل القبلة والمحاريب: اپنے موضوع پر عربی

میں منفرد کتاب ہے، پہلی بار قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئی، اس کے بعد ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی'' کی طرف سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۲-نفحة العنبر فی حیاۃ امام العصر الشیخ محمد انور: اپنے محبوب شیخ کے علمی کمالات وحالات، علمی مزایا وخصوصیات، اشعار، علماء واکابر کی ان کے بارے میں رائے، ان کے فضائل وکمالات کا حسین مرقع ہے، آپ نے اس کتاب کو نہایت عمدہ اوراعلیٰ عربی ادب میں پیش کیا ہے، چنانچہ علماء عرب نے اس کی بہت قدر کی، ایک چوٹی کے عالم نے آپ کولکھا "قرأت کتابك فسجدت لبیانك" یہ کتاب پہلی بار دہلی میں ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی، دوبارہ پاکستان میں ٹائپ سے بہترین شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

۳- یتیمة البیان فی شیئ من علوم القرآن: علوم قرآن پر ایک بے نظیر علمی شاہکار ہے، جو در اصل امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی کتاب "مشکلات القرآن" کا مقدمہ ہے، ۱۹۳۶ء میں دہلی سے اور پھر بعد میں پاکستان میں ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی'' کی طرف سے مستقل کتابی صورت میں ٹائپ سے شائع ہو چکی ہے۔

۴-معارف السنن شرح سنن الترمذی: جامع ترمذی کی بے نظیر محققانہ شرح ہے، چھ جلدوں میں ''کتاب المناسک'' تک ہوئی ہے، ''کتاب الجنائز'' سے آخر تک کا حصہ باقی رہ گیا ہے، افسوس یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی ورنہ علوم نبوت کے شائقین اور حدیث کے پڑھانے والوں کے لیے بہا ذخیرہ ہوتی، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس کو پورا کرنا ہے لیکن

ما کل یتمنی المرأ یدرکه

تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

کچھ دنوں ''دارالتصنیف'' میں بیٹھ کر معارف السنن کی چھٹی جلد کے اخیر

ابواب مکمل کیے، ''معارف السنن'' کے مقدمہ ''عوارف المنن'' پر کچھ کام کیا لیکن پھر گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے اوپر چڑھنا دشوار ہوگیا اور کام معطل ہوگیا۔

۶- عوارف المنن مقدّمه معارف السنن: مستقل کتابی صورت میں ایک جلد پر مشتمل ہے، دو تہائی حصہ مکمل ہو چکا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ اسے چھاپنا شروع کردو، ساتھ ساتھ مکمل کردوں گا، مشاغل اور مصروفیات کی وجہ سے آپ کی زندگی میں اس کے طبع ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، اب عنقریب انشاء اللہ چھپ کر منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔

۷- الأستاذ المودودی وشیئ من حیاته وأفکاره: یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کتاب میں حضرت بنوری رحمہ اللہ نے مولانا مودودی صاحب کے ان غلط نظریات وافکار کو پیش کیا ہے جن سے عام لوگ ناواقف ہیں اور جو ان کے نظریات وافکار وعقائد کے خراب ہونے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، یہ آخری تالیف ہے جو حضرت بنوریؒ نے تحریر فرمائی اس کا تیسرا حصہ بھی آپ نے لکھنا تھا لیکن وقت اجل آپہنچا۔

۸- القصائد البنورية: حضرت بنوری رحمہ اللہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، عربی زبان میں نہایت عمدہ اور آبدار شعر کہتے تھے، یہ کتاب آپ کی وفات کے بعد شائع کی گئی، اس میں آپ کے تمام منظوم کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے جس میں اسلامی شاعری کی مشہور اصناف حمد، مناجات، نعت اور رثاء کے علاوہ بھی کافی نظمیں شامل ہیں جو آپ نے مختلف مواقع پر کہیں، ان قصائد میں سے بعض نعتیں ایسی بھی ہیں جو مصر اور شام کے مجلّات کی زینت بن چکی ہیں۔

۹- المقدمات البنورية: حضرت بنوری رحمہ اللہ کے بہار آفریں قلم سے عربی، فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں پر علمی وتحقیقی مقدمات ہیں، ان مقدمات میں اپنے

موضوع سے متعلق انتہائی نفیس اور قیمتی مباحث ہیں جو کہ آپ جیسی علمی شخصیت ہی کا خاصہ ہے، ان مقدمات میں حدیث کی مشہور کتابوں پر انتہائی تفصیلی مقدمات بھی شامل ہیں جو عالم اسلام کے اہل علم وتحقیق سے داد تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں، جس میں مقدمہ ''نصب الرایہ''، مقدمہ ''فیض الباری''، مقدمہ ''اوجز المسالک'' اور مقدمہ ''لامع الدراری'' شامل ہیں، اس کتاب کی اشاعت بھی آپ کی وفات کے بعد عمل پذیر میں آئی۔

۱۰- بصائر وعبر: اردو زبان میں حالات حاضرہ، قومی وملی مسائل اور ردّ الحاد وزندقہ پر آپ کے علمی وتحقیقی مضامین اور آپ کے بے باک قلم کے اچھوتے شاہکار جامعہ کے ترجمان ''بینات'' کے صفحات پر قارئین کے لیے ہمیشہ ''بصائر وعبر'' کے نام سے بصیرت وعبرت کا سامان بہم پہنچاتے رہے، ان تمام مضامین کو موضوعات کی ترتیب سے الگ الگ عنوانات سے دو جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے، یہ کتاب بھی آپ کی وفات کے بعد طبع ہوئی۔

حضرت بنوریؒ اور سلوک

حضرت بنوریؒ کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ اللہ کے مقرب بندے اور اولیاء اللہ آپ سے بہت محبت کرتے تھے، آپ بھی اہل اللہ کو دل سے چاہتے اور ان کا انتہائی احترام فرماتے تھے، ۱۳۵۷ھ میں (جب آپ بلاد عرب کے مختلف ممالک کے دورے پر تھے) حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی شفیع الدین نگینوی قدس سرہ (خلیفہ ارشد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ) کے دست حق پر بیعت کا شرف حاصل کیا پھر انہیں سے اجازت پائی، حضرت حاجی صاحب نگینویؒ نے فرمایا کہ سلوک کی تعلیم وتربیت کے لیے ہندوستان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ میں سے کسی ایک سے رجوع کریں، حضرت بنوریؒ نے عرض کیا کہ میرا طبعی میلان حضرت مولانا مدنیؒ کی طرف ہے، حضرت حاجی صاحب نگینویؒ

نے صاد فرمایا، چنانچہ ہندوستان واپس آکر ۱۳۵۹ھ میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے فیض صحبت سے تصوف وسلوک کی تربیت کے لیے مستفید ہوتے رہے، حضرت مدنیؒ سے خط وکتابت اور تعلیم وتربیت کا سلسلہ ان کی آخر حیات تک قائم رہا، ساتھ ہی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے خصوصی ربط اور نیازمندانہ تعلق رہا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے آپ کو اپنا مجاز بیعت اور خلیفہ مقرر فرمایا اور اپنے خلفاء میں نام بھی شائع کرایا۔

تحریکات

حضرت بنوریؒ اور مختلف فتنوں کی سرکوبی

حضرت بنوری رحمہ اللہ کا نظریہ تھا کہ علماء کی ذمہ داریاں صرف مدرسہ کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ امت مسلمہ کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی علماء کی ذمہ داری ہے، چنانچہ آپ کی پوری عملی زندگی میں شاید ہی کوئی موقع ایسا آیا ہوگا کہ مسلمانوں کے دینی ماحول ومعاشرہ میں کسی بھی نام سے کفر والحاد یا زیغ وضلال کی دسیسہ کاری یا بغاوت ہوئی ہو اور آپ نے اس کی سرکوبی میں قائدانہ کردار ادا نہ کیا ہو۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ عملی طور پر تو سیاست سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور اصلاح ارشاد کے کام میں مشغول رہے، لیکن جب بھی کوئی دینی تقاضا سامنے آیا تو مولانا بنوریؒ خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑے۔

فتنۂ قادیانیت

قادیانیوں کے خلاف پہلی تحریک ۱۹۵۳ء میں برپا ہوئی، اس وقت مولانا بنوریؒ ٹنڈوالہ یار کے مدرسے میں شیخ التفسیر تھے، آپ نے اس وقت بھی تحریک ختم نبوت میں عملی حصہ لیا، جبکہ اس وقت ''ملک'' بالخصوص کراچی کی کئی نامور شخصیات اس عظیم تحریک کے حوالے سے تردد اور مصلحتوں سے دوچار تھیں، لیکن حضرت بنوری رحمہ اللہ نے اس موقعہ پر

خاموشی کو مداہنت سمجھتے ہوئے کلمۂ حق کہنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس کے کئی سال بعد ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے خلاف دوبارہ تحریک شروع ہوئی تو اس وقت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے جانشین کو اللہ تعالی نے تحریک کی قیادت کے لیے چنا، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ قادیانی تحریک کے بارے میں بڑے فکرمند تھے، ان کی زندگی میں انگریزی اقتدار کی بدولت قادیانیوں نے کشمیر میں جو رسوخ حاصل کرلیا تھا اس پر بہت پریشان تھے، اللہ تعالی نے مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی فکر اور دعا کو قبول فرمایا اور ان کے علوم وانفاس کے وارث اور جانشین مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کو اس جہاد کے لیے تیار کیا، آپ نے قادیانیوں کو اسمبلی کی منظوری سے آئینی طور پر خارج از اسلام قرار دلوایا، مولانا کے علم جہاد کے نیچے تمام دینی وسیاسی جماعتوں نے جمع ہوکر اس تحریک میں حصہ لیا، ضعف، پیرانہ سالی اور گھٹنوں کے درد کے باوجود روزانہ کئی کئی جلسے اور میلوں کا سفر کیا، آپ کے اخلاص، استقامت وللّٰہیت فراست وحسن تدبیر کی برکت تھی کہ اللہ تعالی نے اس فتنہ کے ختم کرنے کا سامان مہیا فرمادیا اور اس طرح سے امام العصر رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

فتنۂ پرویزیت

فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے علاوہ آپ نے غلام احمد پرویز کے فتنہ انکار حدیث کا زبان وقلم سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آپ ہی کی سربراہی میں منکرین حدیث کے کفر کا متفقہ فتوی شائع ہوا، غلام احمد پرویز کے نظریات وافکار کی اشاعت حکومت وقت کے سائے میں ہورہی تھی، حضرت بنوریؒ نے محسوس کیا کہ اس فتنہ کو قلع قمع کرنے کے لیے تمام مکاتب فکر کے علماء کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت ہے، چنانچہ تمام پرویزی لٹریچر کو جمع کرواکر ایک استفتاء کی شکل میں مرتب کیا گیا اور اس کا جواب مفتیِ اعظم پاکستان مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رحمہ اللہ سے لکھوایا اور پھر اس فتوی کو علمائے پاک وہند کے تمام مکاتب

فکر کے بڑے علماء کے سامنے پیش کیا جس پر سب نے تصدیق کی کہ غلام احمد پرویز اور اس کے نظریات اور افکار کا اسلام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔

فتنۂ مشرقیت

علامہ عنایت اللہ مشرقی جس کا دعوی تھا کہ قرآن کے مفہوم و معانی عرش معلی سے پہلی بار انہی کے دماغ پر نازل ہوئے ہیں اور جن کی روشنی میں اس نے قرآن کریم پر مشق شروع کر دی، خاکسار تنظیم کی بنیاد ڈالی، ایک طرف ان کی بیلچہ بردار ''چپ وراست'' کی گونج در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی تو دوسری طرف ان کے ''عسکری اسلام'' نے ذہنی فضا میں ایک ہیجان پیدا کر رکھا تھا، خاکساروں کا دعوی تھا کہ مشرقی صاحب کو علمائے مصر نے ''علامہ'' کا خطاب دیا ہے، حضرت بنوریؒ جب مجلس علمی کی طرف سے مصر گئے تو مشرقی کی کتاب ''تذکرہ'' علمائے مصر کو دکھائی اور اس کی تحریفات و کفریات سے انہیں آگاہ کیا، اس پر علمائے ازہر کی جماعت نے مفتی شیخ یوسف دجوی کی قیادت میں اس کا جواب لکھا، جس میں مشرقی نظریا پر شدید تنقید کی گئی اور انہیں صریح کفر و الحاد قرار دیا گیا۔

فتنۂ تجدد ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے دیگر اہل قلم کے خلاف حضرت بنوریؒ نے جو اقدام کیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل بن جانے کے بعد یہ سمجھتے تھے کہ وہ ''مسند اجتہاد'' پر بھی قابض ہو چکے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اسی راستے پر گامزن تھے جس پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم چل نکلا تھا، چونکہ اس سے قبل پرویز نے مرکز ملت کی حیثیت سے نہ صرف دین میں تغیر و تبدل کے اختیارات سونپ دیے تھے بلکہ دور جدید کے ''خدا اور رسول'' کا منصب بھی عطا کر دیا تھا اس لیے اس وقت کے صدر ان دنوں ایک سرکاری دارالافتاء قائم کرنے کی فکر میں تھے جس کا مفتی اعظم پرویز کو بنانا تجویز ہو چکا تھا، لیکن جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی کاوشوں سے اس فتنے کا

خوب سد باب ہوا اور پرویزیت کی حقیقت لوگوں کے سامنے پوری طرح عیاں ہوگئی، اور ارباب اقتدار اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے، اب انہوں نے اس کے لیے ایک نیا راستہ اختیار کیا، کراچی میں ایک مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کیا گیا، اس میں اسلام پر تحقیقات کرنے کے لیے چن چن کر ایسے افراد بھرتی کیے گئے جن میں اکثریت کج رو کج ذہن ملاحدہ کی تھی اور پھر اس ادارہ کی سربراہی کے لیے میک گل یونیورسٹی کے ایک مستشرق ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو امریکہ سے درآمد کیا گیا، حضرت بنوری رحمہ اللہ نے ان کے الحادی نظریات وافکار پر مضبوط علمی تنقیدیں کیں، بینات کے ادارتی شذرات میں اور عام جلسوں میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے طلسم کا پردہ چاک کیا، اس کے نظریات کے رد میں مستقل ضخیم کتابیں بھی شائع کرائیں۔

فتنۂ مودودیت

سب سے آخر میں جس فتنہ کے خلاف آپ نے علَم جہاد بلند کیا وہ دور جدید کا فتنہ مودودیت ہے، جو کبھی ''تجدید احیائے دین'' کے نام سے ابھرا، اور کبھی ''اقامت دین'' اور ''حکومت صالحہ'' کے نعرے سے، مودودی تحریک کی خاصیت یہ ہے کہ جو شخص اس سے جس قدر زیادہ وابستہ ہوگا اسی قدر اس کی لوح قلب پر صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ''کمزوریوں'' کا نقش ثبت ہوتا جائے گا، مولانا مودودیؒ خود تو اس چودھویں صدی میں ''اقامت دین'' کے داعی اور علمبردار ہونے کا دعوی کرتے ہیں لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ''ٹھیٹھ اسلامی نظام'' کو برپا نہیں کر سکے، وہ ''ٹھیک منہاج نبوت'' پر قائم نہیں رہ سکے، ان کے دور میں جاہلیت کے فلاں فلاں جراثیم درآئے تھے، حضرت عثمانؓ سے فلاں فلاں غلطیاں ہوئی تھیں ،حضرت معاویہؓ کی سیرت وکردار پر جاہلیت کے فلاں فلاں داغ دھبے تھے، ابوموسی اشعریؓ اور عمرو بن عاصؓ نے اقامت دین کے بجائے ڈپلومیسی (سیاسی چالوں) سے کام

لیا وغیرہ وغیرہ، حضرت بنوری قدس سرہ ہمیشہ مودودی تحریک کے مخالف رہے اور وہ ایک عرصہ سے اس پر فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتے تھے، اس کے لیے انہوں نے ضروری مواد بھی فراہم کرلیا تھا، مگر اس خیال سے رک رک جاتے تھے کہ کہیں موجودہ احوال وظروف میں یہ خلاف مصلحت نہ ہو، تا آنکہ وہ وقت آپہنچا کہ انہیں اپنا پیمانۂ عمر لبریز ہوتا نظر آیا، اور انہوں نے آخری وقت میں اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ حضرت بنوریؒ نے "الأستاذ المودودي وشيء من حياته وأفكاره" کے نام سے ایک رسالہ (جو دو حصوں پر مشتمل ہے) لکھا، حضرت کا ارادہ تھا کہ اسلسلہ کے دس حصے رقم فرمائیں گے، دو شائع ہو چکے تھے اور تیسرا زیر قلم تھا کہ خاتمہ بالخیر کا پیغام آپہنچا، حضرت بنوریؒ چاہتے تھے کہ مودودی صاحب مسلک اہل حق کے مطابق اپنی لغزشوں سے رجوع کرلیں اور ان کی تحریروں سے نوخیز طبقہ میں جو نظریاتی کجی پیدا ہوگئی ہے اس کی اصلاح ہو جائے۔

فتنۂ ناصبیت

مودودی تحریک جسے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''خارجیت جدیدہ'' سے تعبیر کیا تھا اس کے ردعمل میں ایک اور فتنہ اٹھا جسے ''ناصبیت جدیدہ'' کا عنوان دیا جانا مناسب ہے، یہ محمود احمد عباسی کی تحریک تھی، موصوف نے ان تمام خرافات کا جو مودودی صاحب کے قلم سے حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے حق میں سرزد ہوئی تھیں، حضرت علیؓ حضرت حسین اور دیگر اہل بیت کرام سے انتقام لینا چاہا، اس تحریک کے سارے لٹریچر میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کو گرایا جائے اور یزید کے مقابلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پست ثابت کیا جائے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کے لیے جس طرح مودودی فتنہ ناقابل برداشت تھا اسی طرح یہ عباسی فتنہ بھی ناقابل مسامحت تھا، چنانچہ ایک زمانہ میں ماہنامہ ''بینات'' کے صفحات اس

فتنہ کی سرکوبی کے لیے وقف رہے۔

حضرت بنوریؒ اور عالم اسلام

حضرت بنوریؒ کے افکار کا افق نہایت وسیع تھا، آپ ہمیشہ بین الاسلامی بلکہ بین الاقوامی سطح پر سوچتے تھے، اپنے ملک کے علاوہ عالم اسلام اور بلاد عربیہ کی دینی علمی اور سیاسی حالات پر ہمیشہ گہری نظر رکھتے تھے، ان کی دینی، علمی اور سیاسی ترقی پر خوشی ومسرت کا اظہار فرماتے اور اگر ان میدانوں میں ان کے ضعف اور کمزوری کی خبر سنتے تو ان کو قلبی رنج پہنچتا، اپنی خوشی یا رنج کا اظہار اپنے خطوط میں فرماتے یا ''بینات'' کے ''بصائر وعبر'' میں بیان فرماتے، اور ساتھ ساتھ اس مرض کا علاج بھی ناصحانہ انداز میں ذکر فرماتے، بعض دفعہ ان ممالک کے ملوک اور رؤسا کو بالمشافہ یا خطوط کے ذریعہ نصیحت فرماتے، آپ کا ہر سفر بلاد عربیہ کا ہو یا دوسرے ممالک کا علمی افادہ یا دعوت وارشاد کی غرض سے ہوتا تھا، آپ نے کسی مادی غرض کے لیے کبھی کوئی سفر نہیں فرمایا۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ کے اسفار کی فہرست بہت طویل ہے، آپ کا اصل سفر حرمین شریفین کا ہوا کرتا تھا، ہر سال رمضان میں عمرہ اور ذی الحجہ میں حج کیا کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم تیل پانی لینے جاتے ہیں تا کہ سال بھر آسانی سے گاڑی چلتی رہے، حرمین شریفین کے علاوہ حضرت شیخ قدس سرہ نے کئی مرتبہ قاہرہ مصر کا بھی سفر کیا، پہلا سفر مجلس علمی کی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں ہوا تھا اور اس کے بعد مجمع البحوث الاسلامیۃ کی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے لیے، اسی طرح آپ نے شام، لبنان، اردن، فلسطین، عراق، لیبیا، کویت، ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان، تنزانیہ، نائیجیریا، کینیا، یوگنڈا، موزمبیق، زمبیا، یونان، فرانس، برطانیہ، ساؤتھ افریقہ، سوئزرلینڈ اور اسپین وغیرہ بلاد عالم کا سفر بھی کیا اور ہر ملک آپ کے قدوم سے سرفراز ہوا، اکثر بلاد اسلامیہ سے آپ کے پاس دعوت نامے آتے رہتے تھے، لیکن کثرت مشاغل اور ذمہ

داریوں کی زیادتی کی وجہ سے عموماً سفر نہ فرماتے تھے لیکن اگر کوئی اہم دینی ضرورت محسوس فرماتے تو خواہ کتنے ہی علیل ہوں سفر میں تاخیر نہ فرماتے۔

اجازت حدیث

حضرت بنوریؒ کو حدیث کی اجازت درج ذیل مشائخ ومحدثین سے حاصل تھی:

۱-امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ۔

۲-حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ۔

۳-حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔

۴-حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔

۵-حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ۔

۶-شیخ حسین بن محمد طرابلسیؒ۔

۷-شیخ علامہ محمد زاہد کوثریؒ۔

۸-شیخ عمر حمدان مقدسی مالکیؒ۔

۹-شیخ محمد بن حبیب اللہ بن مایابی جبنکی شنقیطیؒ۔

۱۰-شیخ خلیل خالدی مقدسیؒ۔

۱۱-شیخہ امۃ اللہ بنت شیخ شاہ عبدالغنیؒ۔

حضرت بنوریؒ کے ان مشائخ کے سلسلۂ سند کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے لیے ان مشائخ کے ''اثبات'' کی مراجعت کی جائے۔

حضرت بنوریؒ کی خدمات

☆ بانی وشیخ الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی۔

☆ رکن "المجمع العلمی العربی" جمہوریہ سوریہ، شام۔

☆ نگران اعلیٰ مجلس علمی جنوبی افریقہ، ہندوستان، کراچی۔

☆رکن "مجمع البحوث الاسلامیه" قاہرہ، مصر۔
☆ شیخ التفسیر دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار، سندھ۔
☆صدر "وفاق المدارس العربیه" پاکستان۔
☆رکن "رابطة العالم الاسلامی"، مکہ مکرمہ۔
☆رکن انتخاب اساتذہ کمیٹی کراچی یونیورسٹی۔
☆صدر مجلس دعوت وتحقیق اسلامی، کراچی۔
☆رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔
☆ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔
☆امیر وقائد عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت۔
☆ صدر کل پاکستان مجلس عمل۔
☆جنرل سیکریٹری جمعیۃ علماء ہند۔
☆ صدر جمعیۃ علماء گجرات وبمبئی۔

رحلت

علم وعرفان، معرفت وایقان کا یہ آفتاب دل کے عارضہ میں تین دن مبتلا رہ کر ۳ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو یکایک غروب ہوگیا، حضرت بنوریؒ کو آپ کے بنائے ہوئے ادارے کے ہی احاطے میں دفن کیا گیا۔

آپ کے تفصیلی حالات وخدمات جاننے کے لیے ماہنامہ ''بینات'' کی خصوصی اشاعت برائے محدث العصر حضرت بنوریؒ کا مطالعہ کیا جائے۔

احسان دانش

علّامہ بنوری

آپ صوبہ سرحد کے رہنے والے اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کے ان شاگردوں میں سے ہیں جنہیں حضرت شاہ صاحب کے علوم و فیوض کا امین کہا جا سکتا ہے، ان کا علم امانت تک ہی نہیں رہا، بلکہ انہوں نے صحیح معنی میں شاہ صاحب کے علم دین کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، جہاں علمی اور ادبی دنیا میں ان کا ایک خاص مقام ہے وہیں عربی، فارسی زبان و محاورے پر اعلیٰ درجے کا عبور ہے، عربی، فارسی زبان کو مادری زبان کی طرح روانی اور برجستگی سے بولتے اور پڑھاتے ہیں، تقریر ہو یا تحریر، تدریس ہو یا انشا پردازی آپ کے لیے کوئی راستہ محدود نہیں۔

آپ نے عراق، شام، بیروت، حجاز اور مصر وغیرہ کے سفر بھی کیے، مصر میں علمائے دیو بند کا تعارف سب سے پہلے آپ ہی نے کرایا تھا اور وہاں کے جرائد میں مضامین لکھ کر اور مختلف مقامات پر تقریریں کر کے اہلِ مصر پر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان میں بھی علم و ادب اور فکر و انشا کے اساتذہ موجود ہیں۔

جب مصر میں علامہ طنطاوی سے ان کی گفتگو ہوئی اور تنقید و تبصرے تک بات پہنچی تو مصنف تفسیر طنطاویؒ نے کئی مقامات پر اِن کے علم کا اعتراف کیا اور استاد کے لقب سے یاد کیا۔

کراچی میں جب آپ پہنچے تو آپ نے اپنے اسلاف کے قدم پر نیوٹاؤن میں بے سروسامانی کے ساتھ تعلیم دینا شروع کیا اور صلہ فقر و فاقہ کے سوا کچھ نہ تھا، چنانچہ فاقوں کے مرحلوں سے گذرے اور تقسیم علم میں کوشش سے رشتہ نہ توڑا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ دارالعلوم [جامعہ] کئی لاکھ کی عمارت ہے، جس میں پندرہ بیس دیگر اساتذہ بھی تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، آپ متعدد کتابوں کے مصنف ومؤلف بھی ہیں اور ان میں ترمذی شریف کی شرح اپنے معیار کے اعتبار سے اور طرزِ ادا کے لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے، خدا ان کے دینی عزائم اور عمر میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

ڈاکٹر احمد حسین

زمانۂ طالب علمی کے تاثرات

شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی اچانک وفات عالمِ اسلامی کا ایک انتہائی اندوہناک سانحہ ہے، حضرت شیخ کی رحلت سے علمی دنیا خصوصاً دنیائے حدیث میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کو پُر نہیں کیا جاسکتا، قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے کبار علماء کثیر تعداد میں ہجرت فرما کر تشریف لائے اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ علم کی شمعیں روشن کیں۔ یہ ان علماء کرام کا ہی طفیل ہے کہ کراچی جیسے تجارتی شہر میں آج بے شمار دینی مدارس موجود ہیں افسوس ہے کہ علم کے یہ آفتاب و ماہتاب ایک ایک کر کے غروب ہوتے جارہے ہیں، اور ان میں سے بڑی بڑی شخصیتیں ہمارے درمیان سے رخصت ہو چکی ہیں، ایک زمانہ تھا کہ کسی بڑے عالم کی وفات سے کچھ علمی نقصان نہیں ہوتا تھا، اس کے تلامذہ اور ہم عصر اس کی کمی کو پورا کردیتے تھے ہمارے اس دورِ انحطاط میں دینی مدارس سے اب وہ متبحر علماء پیدا نہیں ہورہے جو اپنے اساتذہ کی جگہ لے سکیں اس لیے جو ممتاز عالمِ دین اس دنیائے فانی سے رخصت ہوتے ہیں ان کی جانشینی ایک مشکل مسئلہ بن جاتی ہے۔

حضرت شیخ بنوریؒ کا نام یوں تو بہت سُنا تھا دارالعلوم ٹنڈو الہ یار کی شہرت بھی حضرت شیخ بنوریؒ، مولانا بدر عالم، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری کے

سبب سے تھی، افسوس کہ یہ حضرات جلد ہی ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور تابندہ ستاروں کا یہ جھرمٹ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا، مدرسہ ٹنڈو الہ یار سے علیحدگی کے فوراً بعد ہی شیخ نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کی بناڈالی، جس کا راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ طالب علم رہا ہے، جامع مسجد نیوٹاؤن میں اس مسجد کے قیام کے سلسلے میں حضرت شیخ کو خواب میں بعض بشارتیں ہوئیں، ان کی طرف اشارہ مدرسہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کو دی جانے والی سند میں موجود ہے اور ان کا ذکر حضرت شیخ درس کے دوران اپنے تلامذہ سے اکثر فرمایا کرتے تھے سند میں جو نصیحتیں طلبہ کو کی گئی ہیں وہ بھی الہامی ہیں اور ان کا ذکر بھی حضرت شیخ نے اپنے طلبہ کے سامنے کئی بار فرمایا۔

۱۹۵۶ء میں جامعہ کراچی سے عربی میں ایم۔اے کرنے کے بعد راقم الحروف کو درسِ نظامی کی تکمیل کی جستجو ہوئی، اس سے پہلے مختلف فنون کی بعض کتابیں دارالعلوم کراچی میں اور بعض وہاں کے کچھ اساتذہ سے شخصی طور پر پڑھ چکا تھا، مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کے آغاز کو ابھی ایک ہی سال گذرا تھا کہ اس کی شہرت کے چرچے جابجا ہونے لگے، ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ جوق در جوق یہاں پہنچنے لگے، حضرت شیخ بنوریؒ نے ابتداء میں اپنے بعض رفقاء کو اساتذہ کی کمی کے سبب تدریس کے لیے متعین فرمایا جن کا مقصد مدرسہ میں ملازمت نہیں تھا بلکہ وہ مدرسہ کی بنیادیں مضبوط کرنے اور مالی مشکلات سے بے پروا ہو کر دینی خدمت انجام دینے کے لیے تشریف لائے تھے، ان میں مولانا عبدالحق نافع گل، اور مولانا لطف اللہ صاحب کے اسماءِ گرامی قابل ذکر ہیں، حضرت شیخ کو خود بھی اس مدرسہ کے لیے ابتداء میں سخت محنت کرنا پڑی اور بڑی آزمائشوں سے گزرے، شیخ کی لگن، اخلاص اور اللہ تعالیٰ سے مسلسل مانگنے سے آہستہ آہستہ ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں، مدرسہ میں ابتداء ہی سے مختلف علوم کے ماہر اساتذہ کو جگہ دی گئی، جدید عربی سکھانے کے لیے شروع سے مصری اساتذہ یہاں موجود رہے، مدرسہ کی اسی

شہرت سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے بھی اس طرف کا رخ کیا، اور دورۂ موقوف علیہ کے درجہ میں اپنی بے استعدادی کے باوجود داخلہ مل گیا، حضرت شیخ ایسے طلبہ کی تلاش میں رہتے تھے جو جدید مغربی علوم سے واقف ہوں یا جامعات کے فارغ التحصیل ہوں تاکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے مختلف محاذوں پر دین کا کام کیا جاسکے۔ مدرسہ سے وابستگی کے ساتھ پہلے سال میں تو حضرت شیخ سے براہ راست استفادہ کا موقع نہ مل سکا کیونکہ حضرت شیخ دورۂ حدیث کے طلبہ کو صحیح بخاری و جامع ترمذی پڑھاتے تھے تاہم کبھی کبھی آپ کے درس میں تقریر سننے کے لیے یوں ہی شریک ہو جاتے تھے، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی اپنے مشکوٰۃ کے سبق میں حضرت شیخ سے استفادہ کیلئے طلبہ کو کافی حد تک تیار کر دیتے تھے، حدیث، رجال اور اصولِ حدیث کی متداول درسی کتابوں کے علاوہ مولانا نعمانی اپنے سبق میں حدیث کے بے شمار رواۃ، کتابوں اور مصنفین کا ذکر بار بار فرماتے جن سے حدیث کا آغاز کرنے والے طالب علم کے کان نا آشنا ہوتے ہیں، اگرچہ یہ چیزیں پہلے سے طلبہ کو تفصیل کے ساتھ نہ بتائی گئی ہوتیں تو اگلے سال بخاری و ترمذی کے سبق میں حضرت شیخ سے صحیح طور پر استفادہ مشکل ہوتا۔

راقم الحروف نے بخاری و ترمذی حضرت شیخ سے ۵۸۔۱۹۵۷ء میں پڑھیں، اس زمانہ میں دورۂ حدیث میں طلبہ کی تعداد غالباً پندرہ بیس کے لگ بھگ تھی، حضرت شیخ کو مدرسہ کے انتظامی امور کے سبب سبق پڑھانے سے پہلے مطالعہ کا کچھ زیادہ موقع نہ ملتا تھا، اور وہ اس کا ذکر اکثر سبق کے دوران فرمایا کرتے تھے، کبھی فرماتے آج میں نے تمہارے لئے دس منٹ کا مطالعہ کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا دس منٹ کا مطالعہ دوسروں کے کئی گھنٹوں کے مطالعہ سے زیادہ مفید ہوتا، مطالعہ کی فرصت نہ ملنے یا مطالعہ نہ کرنے کے سبب آپ نے نہ کبھی سبق کا ناغہ فرمایا، نہ معذرت کی اور نہ ہی اس سے سبق کی تقریر میں کبھی کوئی کمی محسوس ہوئی، حضرت شیخ کو فنِ حدیث پر زبردست عبور حاصل تھا اور بخاری و ترمذی

سالہا سال تک پڑھانے کے سبب حفظ تھیں اور اپنے شیخ حضرت امام العصر انور شاہ کشمیریؒ کی طرح انتہائی استغراق وانہماک کے ساتھ ان دونوں کتابوں کے درس دیتے تھے، راقم الحروف کو حضرت انور صاحب کی زیارت کا موقع تو نہ مل سکا تاہم حضرت شیخ بنوریؒ کے درس میں بیٹھ کر شیخ کشمیریؒ کے اقوال، مشکل علمی مسائل کے بارے میں حضرت شیخ کی رائے اور اُن کی زندگی کے کوائف سننے کا خوب موقع ملا۔

حضرت شیخ بنوری نے بخاری پڑھانے کے لیے اس کی متعدد شرحوں کو کتنی بار دیکھا ہوگا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ سبق کے دوران مختلف علمی مسائل پر آپ ان کتابوں کے حوالے دیتے، ان کا موازنہ کرتے اور اختلاف کی صورت میں اپنا دوٹوک فیصلہ دیتے، اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کو اپنے اُستاذ کی طرح نہایت قوی حافظہ عطا فرمایا تھا، اِس لئے جو کتابیں بھی حضرت ملاحظہ فرماتے وہ ازبر ہوتیں، اور سبق میں مِن وعَن ان کی عبارتیں نقل فرماتے۔

حضرت شیخ صحیح بخاری کو حدیث کی کتاب کے علاوہ عربی زبان وادب کی ایک اعلیٰ درجے کی کتاب سمجھتے تھے، سبق کے دوران اس کی ادبی حیثیت اور ادبی محاسن کو اکثر مقامات پر اجاگر فرماتے، بعض اوقات بخاری کی کسی روایت کا متن لے کر اس کا دوسری روایتوں سے مقابلہ فرماتے اور امام بخاری کی اس روایت کے انتخاب کی وجہ اس کے الفاظ کی بلاغت کو بتلاتے وہ الفاظ جو ایک پیغمبر کی شایانِ شان ہو سکتے ہیں، امام بخاریؒ نے روایات کے انتخاب میں جتنا سند کو پرکھا تھا اتنا ہی متن کو بھی، آپ نے اپنی کتاب میں ایک روایت ایسی درج نہیں فرمائی جس کے الفاظ فصاحت و بلاغت سے گرے ہوئے ہوں، صحیح کی دوسری امتیازی شان جو حضرت شیخ نے ہمارے سبق میں بار بار فرمائی وہ اس کا ایجاز ہے، اشاروں کنایوں اور مختصر الفاظ میں اپنے مفہوم کو ادا کرنا امام بخاریؒ کا کمال ہے، حضرت شیخ صحیح بخاری کے تراجم پر بہت مفصل تقریر فرمایا کرتے تھے، اور یہ بات

تاکید کے ساتھ فرمایا کرتے کہ تراجم بخاری پر تحقیقی کام ابھی اُمّت کے ذمہ باقی ہے۔

بخاری کے سبق میں حضرت شیخ" فیض الباری کے بھی حوالے دیتے اور اپنے تلامذہ کو جنہیں بخاری کی ضخیم شرحوں تک رسائی میسّر نہ تھی اس کتاب کو پڑھنے کی تاکید فرماتے، حضرت شیخ" کو صحیح بخاری کے ساتھ جو والہانہ شغف تھا وہ حدیث کی کسی دوسری کتاب کے ساتھ نہیں دیکھا گیا، بخاری شروع کرنے سے پہلے حضرت شیخ کئی دن تک صرف حدیث اور اسکی اہمیت پر نہایت مفصل و جامع تقریر فرماتے، پھر اس پس منظر میں صحیح بخاری کی تدوین، اِس سے متعلق جزئیات اور بخاری کے حالات پر کئی روز تک تقریر کرتے، آپ کی یہ ابتدائی تقریریں بے شمار کتابوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہوتیں، حضرت شیخ کے بخاری کے درس میں بیٹھ کر انسان مبہوت رہ جاتا تھا اور سوچنے لگتا کہ ہمارے دور کے حدیث کے اساتذہ کا جب یہ حال ہے تو ان ائمہ حدیث کا کیا حال ہوگا جنہوں نے اپنی ساری عمریں حدیث کی روایت و جمع و تدوین میں صرف کر دیں۔

حضرت شیخ کا جامع ترمذی کا سبق بخاری کے سبق سے مختلف ہوتا تھا، بخاری میں اس کے تراجم، متون کی بلاغت، روزہ پر تفصیلی بحث، حدیث کا مفہوم اور امام بخاری کا نقطۂ نظر بیان فرماتے ترمذی پڑھاتے ہوئے حضرت شیخ" محدث ہونے کے علاوہ زبردست فقیہ نظر آتے تھے، فقہی مسائل پر سیر حاصل بحث فرماتے، ائمہ اربعہ کے دلائل ہر مسئلہ کے بارے میں تفصیل سے بیان کرتے، اِن کی آرا کے درمیان محاکمہ کرتے اور حنفی مسلک کی ترجیح کے دلائل دیتے، عربی زبان میں جامع ترمذی کی کوئی ضخیم اور مفصل شرح موجود نہیں ہے، اس لیے حضرت شیخ نے اپنے استاذ انور شاہ کشمیریؒ کی ترمذی کی تقریر العرف الشذی کو متن بنا کر ترمذی کی شرح تصنیف فرمائی، راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں یہ شائع نہیں ہوئی تھی، بلکہ حضرت شیخ کبھی کبھی اس کا مسوّدہ اپنے ساتھ سبق میں لے آتے تھے، اور سبق کے دوران اس میں سے جستہ جستہ مقامات پڑھ کر سناتے تھے،

حضرت نے یہ کتاب ڈابھیل میں قیام کے دوران لکھی تھی، وہاں بھی اس کو کتاب الحج تک مکمل کر سکے۔ آخری حصہ کی تکمیل کتاب کی اشاعت کے دوران فرمائی، ترمذی کی یہ شرح ''معارف السنن'' کے نام سے کتاب الحج تک چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اگر یہ مکمل ہو جاتی تو معلوم نہیں کتنی ضخیم ہوتی، حضرت شیخ نے اس کتاب کا مقدمہ ایک علیحدہ جلد میں تصنیف فرمایا ہے، اس میں حجیت حدیث پر نہایت اہم بحثیں ہیں اور منکرین حدیث کا مسکت جواب ہے، معارف السنن صرف ترمذی کی شرح ہی نہیں بلکہ یہ علم کا بیش بہا خزانہ ہے، حضرت شیخ نے ایک ایک علمی مسئلہ پر اس کتاب میں جو مواد جمع فرمایا ہے، وہ یکجا کہیں نہیں مل سکتا، کتاب کی خوبی یہ ہے کہ حضرت شیخ ایک موضوع سے متعلق جملہ اقوال و آراء نقل فرمانے کے بعد ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں، اور مختلف آرا کا خاکہ کر کے فیصلہ دیتے ہیں، اس شرح میں مختلف کتابوں کے حوالے جلد وصفحات کے ساتھ موجود ہیں، جو حدیث کی قدیم شرحوں میں نہیں ملتے، اس کی زبان نہایت فصیح و بلیغ ہے، جامع ترمذی کے درس میں حضرت شیخ کا اندازِ تخاطب نہایت سنجیدہ اور علمی ہوتا تھا اور یہی اسلوب آپ نے اپنی کتاب ''معارف السنن'' میں اختیار فرمایا ہے، مناظرہ سے آپ ہمیشہ اجتناب فرماتے تھے۔

حضرت شیخ عوامی تقریر و وعظ کے ماہر نہیں تھے، سبق کے دوران اکثر خود فرماتے تھے کہ میں تو طلبہ کا واعظ ہوں، عوام کا نہیں، حضرت شیخ کی تقریر سمجھنے کے لیے اہل علم یا طلباً درکار تھے، بلکہ مجمع عام میں بھی جب آپ تقریر فرماتے تو وہاں بھی بعض اوقات سنجیدہ و ٹھوس علمی مسائل آ جاتے تھے، جو عوام کی فہم سے بالاتر ہوتے تھے۔ درس میں حضرت شیخ کی تقریر لکھنا بھی دشوار ہوتا تھا، کیونکہ آپ اتنی روانی، تیزی اور برجستگی سے تقریر فرماتے تھے کہ طلبہ اس کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس روانی کا فائدہ یہ تھا کہ مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔

حضرت شیخ اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود سبق کا ناغہ بالکل نہیں فرماتے تھے، اور یہ کہ آپ کو کبھی سفر درپیش ہوتا، یا بعض ناگزیر حالات، سن رسیدگی، علالت اور انتظامی امور ہمارے سبق میں کبھی حائل نہیں ہوتے تھے، سفر سے واپس تشریف لانے کے بعد سہ پہر کو دیر تک، یا رات کو دیر تک پڑھاتے، طلبا کے سبق کے نقصان سے حضرت شیخ کو اذیت ہوتی تھی، آپ ہمیشہ اس کا خاص خیال رکھتے تھے، مدرسہ کے اخیر سال میں کتابیں ختم کرانے کے پیش نظر زیادہ تر وقت تدریس میں ہی صرف کرتے تھے۔

حضرت شیخ کو عربی زبان پر جو عبور حاصل تھا وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، حضرت کو یہ ورثہ غالبًا اپنے شیخ انور شاہ کشمیریؒ سے ملا تھا جو خود بھی عربی کے مسلم الثبوت استاد تھے، اپنے شیخ کی طرح عربی میں نہایت فصیح و بلیغ قصائد لکھتے، مختلف علمی مسائل کو عربی میں نظم کرتے، درس میں اکثر اوقات عربی ہی میں تقریر فرماتے آپ بے تکان عربی بولتے تھے، اور نہایت فصیح درواں عربی لکھتے تھے، عربی میں علمی زبان لکھنے میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا، ''معارف السنن'' اور عربی زبان میں آپ کی دیگر تصانیف آپ کی عربی دانی کا زندہ ثبوت ہیں، علامہ عبدالعزیز میمن ہمارے دور میں پاکستان کے سب سے بڑے عربی زبان وشعر وادب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، راقم الحروف کو موصوف سے جامعہ کراچی میں شعبہ عربی میں چند دنوں استفادہ کا موقع ملا ہے، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ موصوف حضرت شیخ بنوری کی عربیت سے بہت متاثر ہیں، آپ نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ کبھی کبھی میں جمعہ وعیدین جامع مسجد نیوٹاؤن میں مولانا یوسف بنوری صاحب کے پیچھے پڑھتا ہوں، مجھے ان کا خطبہ بہت پسند ہے جو وہ فصیح و بلیغ عربی میں برجستہ دیتے ہیں، راقم الحروف کو اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ حضرت شیخ بنوری کے درس میں طلباء کو عربی زبان وادب سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کا خود بخود شوق پیدا ہوتا تھا، سبق میں حضرت کی تقریر کے دوران اکثر ادبی بحثیں چھڑ جاتی تھیں، حضرت شیخ کو بے شمار عربی اشعار یاد تھے اور

تقریر کے دوران اکثر عربی کے اشعار سنایا کرتے تھے۔

حضرت کا خاص میدان حدیث تھا، اور بلا شبہ اس میں آپ کو کمال حاصل تھا، راقم الحروف کو حضرت کے درس قرآن میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ تفسیر کے امام ہیں، اس پر آپ کو پورا کمال حاصل ہے، قرآن مجید کے مشکل مقامات کو آپ نہایت آسانی سے حل فرما دیتے تھے، جملہ علوم وفنون میں آپ کا یہی حال تھا، جس فن کی کتاب آپ پڑھاتے تھے اس کے امام معلوم ہوتے تھے، فنون کی کتابوں کی اکثر عبارتیں آپ کو حفظ تھیں، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا مسائل فلسفہ سے متعلق طویل قصیدہ آپ کو حفظ یاد تھا۔

حضرت شیخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اس کا کچھ اندازہ ''معارف السنن'' سے بھی لگایا جاسکتا ہے، عربی میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے بارے میں آپ کی معلومات بہت وسیع تھیں، اپنے مدرسہ میں شعبہ تصنیف کے لئے ایک نادر کتب خانہ قائم فرمایا تھا، نیز مجلس علمی کراچی کا کتب خانہ بھی آپ ہی کا رہین منت ہے، حضرت شیخ کو عربی مخطوطات پڑھنے کا بڑا ملکہ تھا، کتنا ہی مشکل سے مشکل اور بدخط مخطوط ہو، آپ اس کی عبارت آسانی سے پڑھ دیتے تھے خود حضرت شیخ کے پاس بعض نادر کتابوں کے قلمی نسخے موجود تھے جو آپ کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔

حضرت شیخ بنوریؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، محدّث، مفسّر فقیہ واصولی، ادیب وانشاپرداز، مجاہد ومتکلم، مدرس ومصنف، ماہر تعلیم، زاہد وصوفی، شفیق استاذ اور ماہر منتظم، ان میں ہر ہر پہلو اتنا جامع ہے کہ اس پر مستقل مقالے لکھے جاسکتے ہیں، اللہ تعالے نے آپ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، اس کا اندازہ ایک عام آدمی نہیں لگا سکتا، اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان موضوعات پر گفتگو کی جاسکے، حضرت شیخ اپنے درس میں طلبہ کو تقویٰ، پاکیزگی نفس، فکرِ آخرت، رزقِ حلال، قناعت پسندی، حرص دنیا سے

اجتناب، دینی خدمت اور علم دین سے وابستگی کی اکثر تلقین فرماتے تھے اور حضرت شیخ خود ان صفات کی پیکر تھے، حضرت نے اپنی ساری زندگی دین کی خدمت میں صرف کر دی، آپ کی پوری زندگی عمل پیہم اور راہِ خدا میں مسلسل جدو جہد کی آئینہ دار ہے، اسلام کی تبلیغ، اسکے دفاع اور مخالفینِ اسلام کا ہر محاذ پر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اس سعی پیہم کے دوران وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی موت ایک عالم کی نہیں، عالَم کی موت ہے، ولكنه بنيان قوم قد تهدّما.

آسمان ان کی لحد پر گوہر افشانی کرے

رحمه الله رحمة واسعةً

جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ



حضرت مولانا بنوری مرحوم ومغفور کے متعلق اپنے تأثرات کیا عرض کروں ان کے رخصت ہونے سے عالم اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا عرصہ تک ممکن نہیں ہوگا، مولانا کا تبحر علمی، بصیرت، تفقہ فی الدین اور دینی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں، سارا عالم اسلام اس کا معترف تھا۔

میرے لیے اسلامی کونسل میں ان کی موجودگی انتہائی تقویت اور حوصلہ افزائی کا باعث تھی، چونکہ کونسل مختلف اذہان ومسالک کے ارکان پر مشتمل ہے، بعض مسائل ومباحث میں اختلاف رائے ناگزیر ہوتا تھا، مگر مولانا مرحوم ہمیشہ اپنے استدلال، تدبر اور حکمت سے اتفاق کا راستہ تلاش کر لیتے۔

وہ علم کے سمندر تھے، بعض مسائل میں اختلاف کے باوجود نہایت خوبی سے انہیں سلجھایا کرتے تھے، جس سے فریقین مطمئن ہوجاتے تھے، ان کا رویہ معقول اور مصالحانہ ہوتا تھا، وہ عدل وانصاف کے علم بردار تھے، انہیں ایک ہی موضوع پر متعدد احادیث اور آیات ازبر ہوتی تھیں، وہ صائب الرائے انسان تھے، اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ کونسل کو ان کا متبادل مشکل سے ملے گا۔

کونسل کے افتتاحی اجلاس کی کاروائی کے بعد راقم الحروف کے متعلق بکمال شفقت ایسے کلمات فرمائے کہ تحدیث نعمت کے طور پر بھی ان کے اظہار میں تأمل محسوس کرتا ہوں۔

کراچی کے دو روزہ اجلاس میں ہم سب جناب خالد اسحاق صاحب کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو تھے، مولانا کسی ضروری کام سے بعجلت تشریف لے گئے، اس کے بعد آخری اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد تشریف لائے تو میرے کمرے میں میرے سخت اصرار کے باوجود اس وقت تک تشریف فرما نہ ہوئے جب تک کہ کراچی میں بلا اجازت و ملاقات رخصت ہونے کی معذرت نہ فرمائی، میں شرم سار ہو رہا تھا مگر مولانا معذرت پر اصرار فرما رہے تھے، تبحر علمی کے ساتھ اخلاق حسنہ کا یہ مظہر میرے لیے ناقابل فراموش ہے، دنیا میں ایسی نادر روزگار ہستیاں کب روز بروز پیدا ہوتی ہیں:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور ہمیں اپنے بزرگان دین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے، آمین۔

ڈاکٹر تقی الدین ندویؒ

دین ودانش کا مہرِ انور

آہ دین ودانش کا مہر انور جو نصف صدی تک اپنی ضیا پاشیوں سے ایک عالم کو منور کر رہا تھا وہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۷ کو غروب ہو گیا یعنی محدث فرید وفقیہہ یگانہ جامع علوم نقلیہ وعقلیہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری ظاہری طور پر ہزاروں انسانوں کو سوگوار چھوڑ کر اس عالم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا کا سانحہ رحلت درحقیقت اس دور کا عظیم ترین حادثہ ہے، وہ مجلس علماء کی رونق، تشنگان علم کا مرجع اور گم گشتگاں راہ کے لئے راہنما تھے ان کا کمال وتبحر اہل علم میں مسلم تھا۔ ان کا فیض ہند وپاک وعالم اسلام میں ہر جگہ جاری تھا۔ مشکل علمی مسائل میں طبقہ علماء کے وہ مرجع وماویٰ تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کے استاد حضرت علامہ کشمیریؒ کی وفات پر ''معارف'' میں لکھا تھا ''مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گرانقدر موتیوں سے معمور ہوں'' بالکل یہی حال حضرت مولانا مرحوم کا تھا ان کے مشائخ بالخصوص علامہ کشمیریؒ نے جو علمی امانت ان کے سپرد کی تھی اس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برا ہوئے، پوری طرح درس وتدریس علم وتحقیق کے میدان میں گزاری، ان کی درسگاہ علم سے سینکڑوں جید علماء تیار ہوئے جو کسی نہ کسی درس گاہ کی

خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ہندوستانی علماء کے پچھلی صدیوں میں علم حدیث میں تبحر و کمال کا تمام عالم اسلامی میں اعتراف کیا جاتا رہا ہے بالخصوص حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کی اولاد و تلامذہ نے علم حدیث کا منارہ اتنا بلند کر دیا تھا کہ کوئی دوسرا ملک اس میں ہندوستان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور اس مبارک سلسلہ میں ہر دور میں علماء و محدثین کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوتی رہی، اس آخر دور میں اس ولی اللّٰہی درست گاہ کے حضرت مولانا درخشاں تارے تھے بلکہ اپنی بعض خصوصیات میں ممتاز و منفرد تھے، جن میں ان کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ ان کی زندگی علم و عمل، زہد و تقویٰ اور حب رسول ﷺ و اتباع رسول کا بہترین نمونہ تھی، ان کے قلب میں حب الٰہی و حب رسول ﷺ کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس کی تسکین حرمین شریفین کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی تھی، ادھر عرصہ سے تقریباً ہر رمضان میں مدینہ منورہ حاضری دیتے اور مسجد نبوی میں اعتکاف فرماتے تھے، اس ناچیز کو بھی ایک مرتبہ وہاں پر انکو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہاں پر حضرت مولانا پر جو سکینت و وقار کا عالم تھا وہ ان کے منور چہرے سے نمایاں تھا، اسی موقع پر اس ناچیز نے ان سے بخاری شریف کی اجازت کی درخواست کی چنانچہ بخاری شریف کے اوائل پڑھائے پھر جملہ کتب حدیث کا اجازت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا، شروع میں ایک مختصر تقریر بھی فرمائی، آنکھیں اشک بار تھیں۔

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

اس طرح تقریباً ہر سال حج بیت اللہ کے لیے بھی تشریف لاتے اور بڑی تعداد ان سے فیض یاب ہوتی، جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے خواہ وہ علم حدیث کا ہو یا فقہ کا، علم کلام کا ہو یا ادب و نحو و بلاغت کا، اس میں متقدمین و متاخرین کی تحقیقات کا خلاصہ و نچوڑ پیش کر دیتے، اپنی اگر کوئی خاص تحقیق ہوتی تو اس کو بھی بیان فرماتے۔

میں نے مصر وشام وحجاز کے اکثر علماء ومشائخ سے ملاقات کی ہے ہندوستانی علماء کا جب ذکر آتا تو حضرت مولانا کا ذکر سرفہرست رہتا، اور انہیں ان کے علم وتحقیق کا معترف ومدح خواں پایا، بالخصوص "معــارف السنن" کو اس دور کی اہم ترین کتابوں میں سمجھتے ہیں بلکہ یہ نادر تحفہ ہے جس کو حضرت مولانا نے عالم اسلامی کے لیے پیش فرمایا، حضرت شاہ صاحب کے علوم کی ترجمانی اور متقدمین کی کتابوں سے اخذ واستفادہ اور اس سے کام کی بات جس طرح حضرت مولانا نے نکالی ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔

اسی طرح مقدمہ "مشکلات القرآن ویتیمۃالبیان" بھی اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، جو شخص تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یا اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام کرنا چاہتا ہے اس کے لیے بہتر رہبر ہیں، یہ کتابیں حضرت مولانا کی شخصیت کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھیں گی:

ہرگز نہ میرد آنکہ دل زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت مولانا نے مدرسہ تعلیم ڈابھیل سورت میں عرصہ تک قیام فرمایا تھا اور وہاں پر درس وتحقیق کا ایک زمانہ گزارا ہے مدرسہ میں ایک اچھا کتب خانہ بھی ہے آج سے چند سال پیشتر میں نے رسالہ ''الفرقان''، لکھنؤ میں ''ہندوستان میں علم حدیث'' کے عنوان پر مقالات کا ایک سلسلہ لکھا ہے عام طور پر غلط فہمی ہے کہ ہندوستان کی ابتدائی صدیوں میں فقہ وتصوف اور منطق وفلسفہ کے ائمہ فن تو اس ملک میں موجود تھے مگر علم حدیث سے اس کا دامن خالی تھا میں نے اس کی تردید کی ہے کہ بلاشبہ یہ علوم اس ملک میں غالب تھے بلکہ ہندوستان کی سرزمین پر ان صدیوں میں بھی متعدد محدثین کا تذکرہ ملتا ہے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں دیکھیں، وہاں کے کتب خانہ میں "سبحۃالمرجان فی آثار ھـنـدوستـان" جو علامہ بلگرامی کی مشہور کتاب ہے اس میں علامہ صغانی کے ترجمہ میں

حضرت مولانا بنوریؒ کے قلم سے حاشیہ پر جا بجا لکھا ہوا ملا ہے حضرت مولانا نے اس میں علامہ صغانی کے اساتذہ میں متعدد ہندوستانی محدثین کا ذکر فرمایا ہے اس کو پاکر بیحد مسرت ہوئی اس سے حضرت مولانا کی تاریخ پر نظر کا اندازہ ہوا اس کے علاوہ متعدد کتابوں پر ان کے بڑے قیمتی حواشی تھے۔

کمال، جامعیت، تبحر علمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مولانا صاحب کی ذات گرامی کو انکساری اور تواضع کا پیکر بنایا تھا وہ اپنے چھوٹوں پر جس طرح شفقت اور اپنے تلامذہ کی جس طرح خاطر داری فرماتے تھے اس کی مثالیں اس دور میں عنقا ہیں، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں جرأت و ہمت اور حق کی حمایت ونصرت کا ایسا جذبہ ودیعت فرمایا تھا کہ سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی وہ کسی باطل تحریک اور کسی ایسی بات کا تحمل نہیں فرما سکتے تھے جو کتاب وسنت کی شاہراہ سے ہٹی ہوئی ہو یا سلف صالحین کے مسلک پر نہ ہو اس سلسلہ میں وہ زبان وقلم دونوں طاقتوں کو استعمال فرماتے تھے اس ناچیز نے اپنی آخری ملاقات ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو عرض کیا کہ حضرت آپ کی ہر کتاب کو بہت غور سے پڑھتا ہوں اور ہر صفحہ پر نئی بات ملتی ہے اور بہت سے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر غور سے کوئی انصاف پسند پڑھے گا تو راہ راست پر آجائے گا کیا عجب ہے کہ جس تحریک کی گمراہیوں وغلطیوں کا پردہ جناب نے فاش کیا ہے اس میں بہت سے لوگ اپنے غلط خیالات سے تائب ہو جائیں یہ سب کچھ ہے مگر لہجہ بہت تیز ہے فرمایا آپ کا مقصد یہ ہے کہ میں لکھنوی انداز میں لکھتا۔ میں نے جو بات حق سمجھی بلا خوف لومۃ لائم لکھ دی ہے اور آئندہ مزید لکھوں گا اس سلسلہ میں مجھے کسی ملامت کی پرواہ نہیں، سلف صالحین میں بھی ایک جماعت کا یہی مسلک رہا ہے کہ دین میں کسی مفسدہ کے جب پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو بڑی شدت سے اس کی تردید فرماتے، اور بعض لوگوں کا حال یہ تھا کہ اس مفسدہ کی شناعت اسی درجہ کی ان کے نزدیک بھی تھی مگر اس

کا رفع کرنے کے لیے دوسرا انداز اختیار فرماتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ اپنی آخری زندگی میں نابینا ہو گئے تھے ایک مرتبہ ایک مسجد میں نماز کے لیے داخل ہوئے وہاں پر انہوں نے سنا کہ اقامت و اذان کے درمیان لوگوں کو نماز کے لئے بلند آواز سے دعوت دی جارہی ہے خادم سے فرمایا کہ اس مسجد سے نکل چلو دوسری مسجد میں نماز پڑھیں گے حالانکہ نفس الامر میں یہ بات حرام کے درجے کی نہیں تھی بلکہ کراہت کے درجے کی بدعت تھی مگر اس کو بھی گوارا نہ فرمایا اور جب اس سے بڑا مفسدہ ہو اس کے لیے تحریر میں تیزی کا آجانا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، اس ملت کا ایک خاص مزاج ہے:

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

حضرت امام مالکؒ کا مشہور مقولہ ہے'' کہ اس امت کی اصلاح اسی راستہ پر چل کر ہوگی جس پر سلف صالحین گامزن تھے''۔

ان کے کارناموں میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ہے جس کے حضرت مولانا موسّس و بانی ہیں اس مدرسہ نے جس کے قیام کی مدت ۲۵ سال سے بھی کم ہے اس قلیل عرصہ میں اسے بے سر و سامانی کے باوجود حضرت مولانا کی مخلصانہ کوششوں سے اس قدر ترقی ہوئی کہ وہ اب نہ صرف پاکستان کی مرکزی درسگاہ ہے بلکہ عرب ممالک میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حضرت مولانا ابھی اس کو بہت ترقی دینا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کا غیب سے انتظام فرمائے۔

ادھر آخری دور میں خصوصیت سے حضرت استاذنا الکبیر برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ سے خصوصی تعلق ہو گیا تھا اور اس میں روز افزوں اضافہ تھا حضرت بھی ان کا بہت خیال فرماتے تھے حضرت کی فرمائش پر ان کی بخاری کی شرح "لامع الدراری" اور موطا کی شرح "اوجز المسالك" پر بڑے فاضلانہ مقدمے تحریر فرمائے

ہیں جو ان دونوں کتابوں کے ساتھ طبع ہو چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دونوں مقدمے علمی و تحقیقی نوادر پر مشتمل ہیں ادبی حیثیت سے بھی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے حضرت مولانا کی عربی زبان وادب پر غیر معمولی قدرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جولائی ۱۹۷۷ء کو ہندوستان سے واپسی پر تین دن حضرت مولانا کے مدرسہ میں قیام رہا، اور ان کی شفقتوں سے محظوظ ہونے کا موقع ملا، ۷ جولائی کو ناشتہ ان کے دسترخوان پر کیا اس کے بعد رخصت فرمایا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مجھے تعجب ہو رہا تھا مگر کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے اب اس بہار کو دیکھنے کو موقع ملے گا ہی نہیں، اور وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے پاکستان ریڈیو سے اور اس کے بعد یہاں کے اخبار ''الاتحاد'' سے اس سانحہ کی اطلاع ہو کر بہت ہی رنج وقلق ہے یہاں کے علما ومشائخ سب نے رنج کا اظہار کیا، بالخصوص یہاں کے قاضی القضاۃ شیخ احمد بن عبدالعزیز آل مبارک جو یہاں کے سب سے بڑے عالم ہیں، حضرت مولانا سے عقیدت وتعلق رکھتے تھے ابوظبی آنے کی دعوت بھی دے چکے تھے۔ انہوں نے بہت ہی رنج وغم کا اظہار کیا اور بار بار یہ کہتے رہے کہ اب ان کا بدل کہاں ملے گا اور یہاں سے تعزیتی تار ارسال کیا اور ایک مقالہ لکھ کر خدام الدین اور البینات میں روانہ کر رہے ہیں خدام الدین کے خصوصی نمبر کا انتظار رہے گا، اللہ تعالیٰ مولانا کے فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے اور پوری امت کو فیض یاب فرمائے، اوران کو جنت کے اعلیٰ مقام میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مفتی محمد تقی عثمانی

آہ حضرت بنوری

بقیۃ السلف، استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوری (رحمۃ اللہ علیہ) بھی راہیِ آخرت ہو گئے، آج جبکہ اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں تو یادوں کا ایک طویل سلسلہ قلب و ذہن میں اس طرح مجتمع ہے کہ ابتدا کرنے کے لیے سرا ہاتھ نہیں آتا۔ حضرت مولانا بنوریؒ کی شخصیت ایسی دل نواز، ایسی حیات افروز، ایسی باغ و بہار اور ایسی بھاری بھرکم شخصیت تھی کہ اس کی خصوصیات کا ایک مختصر مضمون میں سمانا مشکل ہے، ان کی ذات اپنے شیخ حضرت علامہ سیّد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی مجسم یادگار تھی، علم حدیث تو خیر ان کا خاص موضوع تھا جس میں اس وقت ان کا ثانی ملنا مشکل تھا لیکن اپنے شیخ کی طرح وہ ہر علم وفن میں معلومات کا خزانہ تھے، ان کی قوتِ حافظہ، ان کی وسعتِ مطالعہ، ان کا ذوق کتب بینی، ان کی عربی تقریر وتحریر ان کا پاکیزہ شعری مذاق، اکابر واسلاف کے تذکروں سے ان کا شغف علماء دیو بند کے ٹھیٹھ مسلک پر تصلب کے ساتھ ان کی وسعت نظر اور رواداری، دین کے لیے ان کا جذبہ اخلاص وللّٰہیت، اندازِ زندگی میں نفاست، سادگی اور بے تکلفی کا امتزاج، ان کا ذوقِ مہماں نوازی، ان کی باغ و بہار علمی مجلسیں، ان کے عالمانہ لطائف وظرائف، ان میں سے کون سی ایسی چیز ہے جسے بھلایا جا سکتا ہو؟

دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے کسی کو علم کے حقیقی ثمرات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے ''پیش مردے کاملے پامال شو'' پر عمل کی ضرورت ہے، حضرت مولانا بنوری صاحبؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے جو مقام بلند نصیب فرمایا وہ ان کی ذہانت وذکاوت اور علمی استعداد سے زیادہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے فیض صحبت اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے فیض نظر کا نتیجہ تھا انہوں نے تحصیل علم کے لیے کسی ایک مدرسے میں صرف کتابیں پڑھ لینے اور ضابطہ کی سند حاصل کر لینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے اساتذہ کی خدمت وصحبت سے استفادہ کو اپنا نصب العین بنایا، آپ ایک ایسے وقت دارالعلوم دیوبند پہنچے تھے جب وہاں امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ جیسے آفتاب و ماہتاب مصروف تدریس تھے حضرت مولانا بنوریؒ اپنے تمام ہی اساتذہ کے منظور نظر ہیں لیکن امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے آپ کو جو خصوصی تعلق رہا اس کی مثال شاید حضرت شاہ صاحب کے دوسرے تلامذہ میں نہ ملے، مولانا مرحوم نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت وصحبت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک سفر وحضر میں اپنے شیخ کی نہ صرف معیت سے مستفید ہوتے رہے، بلکہ ان کی خدمت اور ان سے علمی وروحانی استفادے کی خاطر مولاناؒ نے نہ جانے کتنی مادی اور دنیوی مفادات کی قربانی دی، اللہ تعالیٰ نے انہیں جن غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، ان کے پیش نظر اگر وہ چاہتے تو تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد نہایت خوشحال زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت اور علمی مذاق کی تسکین پر ہر دوسرے فائدے کو قربان کر دیا۔ اور یہ بات خود انہوں نے احقر کو سنائی تھی کہ ''جب

میرا نکاح ہوا تو بدن کے جوڑے کے سوا میری ملکیت میں کچھ نہ تھا۔''

علم دین کے لیے مولانا کی یہ قربانیاں بالآخر رنگ لائیں، حضرت شاہ صاحبؒ کی نظرِ عنایت نے علمی رسوخ کے ساتھ ساتھ ان کی للّٰہیت اور اخلاص عمل کے فضائل کی آبیاری کی، اور اس کا نتیجہ تھا کہ دین کے خدآم میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبولیت، محبوبیت اور ہردلعزیزی کا وہ مقام بخشا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، ان کے اساتذہ، ان کے ہم عصر اور ان کے چھوٹے تقریباً سب ان کے علمی مقام اور ان کی للّٰہیت کے معترف رہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ جیسے مردم شناس بزرگ کی خدمت میں مولاناؒ کی حاضری تین چار مرتبہ سے زیادہ نہیں ہوئی لیکن انہی تین چار ملاقاتوں کے بعد حضرت تھانوی نے ان کو اپنا مجازِ صحبت قرار دے دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوریؒ کو اس دور میں علمی و دینی خدمات کے لیے نہ صرف چن لیا تھا، بلکہ ان کے کاموں میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی، ان کے علم وفضل کا سب سے بڑا شاہکار ان کی جامع ترمذیؒ کی شرح "معارف السنن" ہے جو تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے چونکہ پچھلے سات سال سے دارالعلوم کراچی میں جامع ترمذیؒ کا درس احقر کے سپرد ہے، اس لیے بفضلہٖ تعالیٰ مولاناؒ کی اس کتاب کے مطالعے کا خوب موقع ملا ہے، اور اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ احقر کو اس کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہے، لہٰذا اس میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے محدثانہ مذاق کی جھلک کسی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے تو وہ معارف السنن ہے، افسوس ہے کہ علم وفضل کا یہ خزانہ تشنہ تکمیل رہے گا اور کتاب الحج کے بعد اس کی تصنیف آگے نہ بڑھ سکی، احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے نہ جانے کتنی بار مولاناؒ سے اس کی تکمیل کی طرف توجہ دینے کی خواہش ظاہر فرمائی، لیکن مولاناؒ کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ وہ اس

خواہش کو پورا نہ فرما سکے، اب اول تو اس کی تکمیل کی ہمت کون کرے؟ اور اگر کوئی کرے بھی تو حضرت شاہ صاحبؒ کا وہ فیضانِ علمی اور حضرت مولانا بنوریؒ کا وہ اسلوب بیان کہاں سے لائے؟

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو عربی تقریر و تحریر کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ اہل عجم میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے، خاص طور سے ان کی عربی تحریریں اتنی بے ساختہ، سلیس، رواں اور شگفتہ ہیں کہ ان کے فقرے فقرے پر ذوق سلیم کو جھلملتا ہے، اور ان میں قدیم و جدید اسالیب اس طرح جمع ہو کر یک جان ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والا جزالت اور سلاست دونوں کا لطف ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے، مولاناؒ کی تحریروں میں اہل زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور استعارے ایسی بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ بہت سے عربوں کی تحریروں میں بھی یہ بات نہیں ملتی۔ "نفحة العنبر" تو ایک طرح سے خالص ادبی تصنیف ہے، لیکن "معارف السنن" اور "يتيمة البيان" جیسی ٹھوس علمی اور تحقیقی تصانیف میں بھی ادب کی چاشنی اس انداز سے رچی بسی ہوئی ہے کہ وہ نہایت دلچسپ اور شگفتہ کتابیں بن گئی ہیں۔

حضرت مولانا بنوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے حق کے معاملے میں غیرت و شدت کا خاص وصف عطا فرمایا تھا، وہ اپنی انفرادی زندگی اور عام برتاؤ میں جتنے نرم خلیق اور شگفتہ تھے، باطل نظریات کے بارے میں اتنے ہی شمشیر برہنہ تھے اور اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت یا نرم گوشے کے روادار تھے، اور نہ مصالح کو اہمیت دیتے تھے بعض اوقات ان کی تحریر یا تقریر کے بارے میں یہ شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ عام دینی مصالح کے خلاف ہو، لیکن چونکہ ان کے اقدامات کا محرک للّٰہیت اور اخلاص کے سوا کچھ نہ تھا اس سے اللہ تعالیٰ ان کے اقدامات میں برکت عطا فرماتے، ان کے بہترین نتائج ظاہر تھے، اور ''لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف'' کا عملی مشاہدہ ہوتا چنانچہ باطل فرقوں اور نظریات کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے مولانا

سے بڑا کام لیا، انکا حدیث کا فتنہ ہو یا تجدد اور قادیانیت کا، مولانا ہمیشہ ان کے تعاقب میں پیش پیش رہے، اس کے علاوہ جس کسی نے بھی قرآن وسنت کی تشریح میں جمہور امت سے الگ کوئی راستہ اختیار کیا، مولاناؒ سے یہ برداشت نہ ہوسکا کہ اس کے نظریات پر سکوت اختیار کیا جائے، مولانا کو خاص طور سے اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ علماء دیوبند کا مسلک کسی غلط نظریے سے ملتبس نہ ہونے پائے اور سیاسی سطح پر کسی شخص کے ساتھ علمائے دیوبند کے اتحاد وتعاون سے یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ علمائے دیوبند اس شخص کے نظریات کے ہم نوا ہیں۔

مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے آزادی ہند کے لیے جو جدوجہد کی مقتدر علمائے دیوبند کی ایک جماعت نہ صرف اس کی مداح رہی بلکہ ان کے ساتھ اتحاد وتعاون بھی کیا، اور خود مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہت سے ان کی بعض خوبیوں کے معترف تھے لیکن اس سیاسی اشتراک کی بنا پر یہ خطرہ تھا کہ مولانا آزاد مرحوم نے جن مسائل میں جمہور سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، انھیں علمائے دیوبند کی طرف منسوب نہ کیا جانے لگے، یا کم از کم علمائے دیوبند کی خاموشی کو ان نظریات کی تائید نہ سمجھ لیا جائے، اس لیے مولانا آزاد مرحوم کے ان نظریات کی علمی تردید کے لیے حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہ، نے ایک مفصل مقالہ لکھا جس پر بعض لوگوں نے بُرا بھی منایا، لیکن مولاناؒ نے اس معاملہ میں کسی ''لومۃ لائم'' کی پرواہ نہیں کی، مولاناؒ کا یہ مقالہ "مشکلات القرآن" کے مقدمے میں شامل ہے، جواب "یتیمۃ البیان" کے نام سے الگ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے رکن رکین رہے ہیں، اور آزادئ ہند کے لیے انھوں نے بے مثال قربانیاں دی ہیں، اس لیے علمائے دیوبند نے اس جہت سے ہمیشہ انکی قدر دانی کی ہے، اور جہاں آزادئ ہند کے لیے علمائے دیوبند کی جدوجہد کا ذکر آتا ہے وہاں مجاہدین کی فہرست میں مولانا عبیداللہ

سندھی مرحوم کا نام بھی شامل ہوتا ہے، لیکن مولانا سندھی مرحوم دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ نہ تھے، اور ان کے نظریات میں دینی اعتبار سے وہ تصلب نہ تھا جو علمائے دیوبند کا طرّہ امتیاز رہا ہے، اسی لیے وہ بعض عقائد واحکام میں وقتاً فوقتاً جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے تھے، احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے کسی ایسے ہی نظریے کا اعلان کردیا تھا جو جمہور علمائے امت کے خلاف تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو فہمائش کی، اور بات سمجھ میں آنے پر انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور ندامت کا اظہار کیا، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد کوئی شخص ایسا نہ رہا جو نظریاتی طور پر ان کی رہنمائی کرسکے، اس کے علاوہ ان کے مزاج میں مسلسل مصائب جھیلنے سے تشدّد بھی پیدا ہوگیا، چنانچہ آخری دور میں انھوں نے پھر بعض ایسے نظریات کی تبلیغ شروع کردی جو جمہور علمائے امت کے خلاف، بلکہ نہایت خطرناک اور زائغانہ تھے، ادھر چونکہ علمائے دیوبند کی جدوجہدِ آزادی میں برابر مولانا سندھی مرحوم کا نام آتا تھا، اس لیے خطرہ تھا کہ ان کے نظریات علماء دیوبند کی طرف منسوب نہ ہوں اس لیے حضرت مولانا بنوری نے نہ صرف مولانا سندھی کے ان نظریات کی تردید کی، بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس طرف متوجہ کیا جو سیاسی جدوجہد میں مولانا سندھی مرحوم کے رفیق رہے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا مدنی قدس سرہ نے مولانا سندھی مرحوم کے ان نظریات کی تردید میں ایک مضمون لکھا جو اخبار مدینہ ''بجنور'' میں شائع ہوا، مولانا سندھی مرحوم کی تردید کے بارے میں تمام تفصیلات احقر نے خود حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہیں۔ اور گذشتہ سال دوبارہ مولاناؒ نے احقر سے ان کی توثیق فرمائی۔

جماعت اسلامی کے حضرات سے اجتماعی معاملات میں مختلف مراحل میں مختلف علمائے دیوبند کا اشتراک عمل جاری رہا، بائیس دستوری نکات کی ترتیب اور تحریک ختم

نبوت وغیرہ میں خود مولانا نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا، لیکن جہاں تک مولانا مودودی صاحب کے نظریات کا تعلق ہے، مولانا نے ان پر مفصل تنقید فرمائی، اور حال ہی میں عربی زبان میں یکے بعد دیگرے تین کتابچے تحریر فرمائے، جن میں سے دو شائع ہو چکے ہیں، اور تیسرا زیر طبع ہے۔

غرض یہ مولانا کا خاص مزاج تھا کہ وہ جمہور علمائے سلف کے خلاف کسی نظریے کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکتے تھے، عام مجلسوں میں بھی ان کا یہی رنگ تھا کہ غلط بات پر بروقت تنقید کر کے حق گوئی کا فریضہ نقد ادا کر دیتے تھے، ۱۹۶۸ء میں جب ادارۂ تحقیقات اسلامی کی طرف سے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی (جس کا اہتمام ادارۂ تحقیقات کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے کیا تھا) تو اس کے پہلے ہی اجلاس میں ایک مقرر نے حضرت عمرؓ کی اوّلیات کو غلط انداز میں پیش کر کے تجدد دین کے آزاد اجتہاد کے لیے گنجائش پیدا کرنی چاہی اور اس کے لیے انداز بھی ایسا اختیار کیا کہ جیسے قوت اجتہادیہ میں حضرت عمرؓ کے اور ہمارے درمیان کوئی خاص فرق نہیں، اس محفل میں عالم اسلام کے معروف اور جید علماء موجود تھے، لیکن اس موقع پر اس بھرے مجمع میں جن صاحب کی آواز سب سے پہلے گونجی، وہ حضرت مولانا بنوریؒ تھے، انہوں نے مقرر کی تقریر کے دوران ہی صدر محفل مفتی اعظم فلسطین مرحوم سے خطاب کر کے فرمایا:

"سیدی الرئیس! أرجوكم أن تلجموا هذا الخطيب أرجوكم ان تلجموه، ماذا يقول؟"

''جناب صدر! ان مقرر صاحب کو لگام دیجئے، براہ کرم ان کو لگام دیجئے، یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

ان کے یہ بلیغ الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں!

مولانا کی رگ و پے میں اس بات کا یقین و اعتقاد پیوست تھا کہ اکابر علماء

دیوبند اس دور میں " ماانا علیه و اصحابی "کی عملی تفسیر تھے اور ان کا فہم دین اس دور میں خیر القرون کے مزاج و مذاق سے سب سے زیادہ قریب تھا، وہ چاہتے تھے کہ اکابر دیوبند کے اذکار اور ان کے علمی و دینی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، چنانچہ جب مولاناؒ ایک طویل عرصے کے لیے پہلی بار حجاز اور مصر و شام کے سفر پر تشریف لے گئے تو وہاں قیام کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کی خدمات اور ان کی علمی تحقیقات سے عالم عرب کو روشناس کرایا جائے، چنانچہ مولاناؒ نے علماء دیوبند اور ان کی علمی خدمات پر مفصل مضامین لکھے جو وہاں کے صفِ اول کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے، اور ان کے ذریعے مصر و شام کے چوٹی کے علماء مولانا بنوریؒ سے قریب آ گئے، مولاناؒ نے انہیں مختلف صحبتوں میں اکابر دیوبند کے علوم سے متعارف کرایا اور کم از کم علماء کی حد تک مصر و شام میں علماء دیوبند کے کارنامے اجنبی نہیں رہے۔

اسی دوران ایک مشہور عربی رسالے کے دفتر میں مولاناؒ کی ملاقات علامہ جوہر طنطاوی مرحوم سے ہوگئی جن کی "تفسیر الجواهر" اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے، بعض لوگوں نے تو امام رازیؒ کی تفسیر کبیر پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ " فیه کل شیء الا التفسیر "(یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ تفسیر کبیر کے بارے میں یہ جملہ بہت بڑا ظلم ہے، ہاں اگر موجودہ دور میں کسی کتاب پر یہ جملہ کسی درجے میں صادق آ سکتا ہے تو وہ علامہ طنطاوی مرحوم کی تفسیر الجواہر ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب تفسیر کی نہیں، بلکہ سائنس کی کتاب ہے اور سائنس کی باتوں کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کے شوق میں علامہ طنطاوی مرحوم نے بعض جگہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔

علامہ طنطاوی مرحوم سے حضرت مولانا بنوریؒ کا تعارف ہوا تو انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ کیا آپ نے میری تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا کہ "ہاں! اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر کتاب کے بارے میں رائے قائم کرسکتا ہوں،" علامہ طنطاوی نے

رائے پوچھی تو مولانا نے فرمایا، '' آپ کی کتاب اس لحاظ سے تو علماء کے لیے احسان عظیم ہے کہ اس میں سائنس کی بے شمار معلومات عربی زبان میں جمع ہوگئی ہیں، سائنس کی کتابیں چونکہ عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں اس لیے عموماً علمائے دین ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، آپ کی کتاب علماء دین کے لیے سائنسی معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن جہاں تک تفسیر قرآن کا تعلق ہے، اس سلسلے میں آپ کے طرز فکر سے مجھے اختلاف ہے، آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عصرِ حاضر کے سائنس دانوں کے نظریات کو کسی نہ کسی طرح قرآن کریم سے ثابت کردیا جائے، اور اس غرض کے لیے آپ بسا اوقات تفسیر کے مسلّمہ اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کرتے، حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ سائنس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں، آج آپ جس نظریے کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کل وہ خود سائنس دانوں کے نزدیک غلط ثابت ہوجائے، کیا اس صورت میں آپ کی تفسیر پڑھنے والا شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآن کریم کی بات (معاذ اللہ) غلط ہوگئی!

مولاناؒ نے یہ بات ایسے مؤثر اور دلنشین انداز میں بیان فرمائی کہ علامہ طنطاوی مرحوم بڑے متاثر ہوئے اور فرمایا:

"أيها الشيخ ! لست عالماًهنديا وانما أنت ملك أنزله الله من السماء لا صلاحي"

(مولانا! آپ کوئی ہندوستانی عالم نہیں ہیں، بلکہ آپ کوئی فرشتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لیے نازل کیا) یہ واقعہ میں نے مولاناؒ سے بارہا سنا، اور شاید ''بینات'' کے کسی شمار میں بھی مولانا نے اسے نقل بھی کیا ہے۔

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کو مولانا بنوریؒ سے بڑی محبت تھی، اور ان کے اخلاص وللّٰہیت اور علمی وعملی صلاحیتوں کی بڑی قدر فرماتے تھے، اگرچہ

دارالعلوم کے جلسوں میں کئی بار مولاناؒ نے تقریر کے دوران فرمایا کہ حضرت مفتی صاحبؒ میرے استاذ ہیں، اور میں نے مقامات حریری آپ ہی سے پڑھی ہے، لیکن حضرت والد صاحبؒ مولاناؒ کے علمی وعملی کمالات کی بناء پر ان کا نہایت اکرام فرماتے تھے، چنانچہ یہ دونوں بزرگ علمی اور اجتماعی مسائل میں ایک دوسرے سے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے، ملاقاتیں اور مشورے تو پہلے بھی رہتے تھے، لیکن جب سے مولاناؒ کراچی میں قیام پذیر ہوئے، اس وقت سے تو دونوں بزرگوں کے درمیان آمد ورفت بہت بڑھ گئی تھی اس وجہ سے ہم خدام کو گذشتہ بیس سال میں حضرت مولانا بنوریؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور جتنا جتنا قرب بڑھتا گیا، اسی نسبت سے مولاناؒ کی محبت وعظمت اور عقیدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا حضرت والد صاحبؒ اور مولاناؒ نے جدید فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن اور دارالعلوم کراچی کے علماء پر مشتمل ایک مجلس تحقیق مسائل حاضرہ قائم فرمائی تھی جس کا اجلاس ہر ماہ دارالعلوم کورنگی یا مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن میں منعقد ہوا کرتا تھا یہ مجلس عام طور سے صبح کو شروع ہوکر شام تک جاری رہتی، بیچ میں کھانے اور نماز کا وقفہ ہوتا، پیچیدہ فقہی مسائل زیر بحث آتے، کتابوں کا اجتماعی طور سے مطالعہ ہوتا، تمام شرکاء مجلس اپنا اپنا نقطہ نظر آزادی سے پیش کرتے، ہم جیسے فرومایہ خدام بھی اپنے طالب علمانہ شبہات کھل کر پیش کرتے، اور یہ بزرگ کمال شفقت کے ساتھ انہیں سنتے اور جب تک تمام شرکاء مطمئن نہ ہو جاتے فیصلہ نہ ہوتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا بنوریؒ دونوں کی طبیعت ان مجلسوں میں کھل جاتی تھی اور ہم خدام دونوں کے علمی افادات سے نہال ہو جاتے، اور پھر یہ مجلسیں خشک علمی مسائل تک محدود نہ تھیں، بلکہ دونوں بزرگوں کی شگفتہ مزاجی اور علمی و ادبی مذاق نے ان مجلسوں کو ایسا باغ و بہار بنا دیا تھا کہ مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کا انتظار لگتا تھا، علمی تحقیقات کے علاوہ یہ مجلسیں نہ جانے کتنے لطائف

وظرائف اور دلچسپ وسبق آموز واقعات سے معمور ہوتی تھیں، حضرت والد صاحبؒ کا ذہن اکابر علمائے دیو بند کے واقعات کا خزانہ تھا، اور کوئی بھی موضوع چھڑ جائے حضرت والد صاحبؒ دیو بند کے بزرگوں میں سے کبھی حضرت تھانویؒ کا کبھی حضرت میاں صاحب کا، کبھی حضرت شاہ صاحبؒ کا، کبھی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا، اور کبھی کسی اور بزرگ کا کوئی واقع سنا دیتے اور مجلس کے لیے رہنمائی کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا، حضرت مولانا بنوریؒ نے بارہا فرمایا کہ مجھے تو حضرت مفتی صاحبؒ سے ملاقات کا شوق اس لیے لگتا ہے کہ ان کے پاس پہنچ کر اپنے بزرگوں کے نئے نئے واقعات سننے کو مل جاتے ہیں، ادھر حضرت بنوریؒ کو حضرت شاہ صاحبؒ سے جو خصوصی صحبتیں رہیں، حضرت والد صاحبؒ ان کے حالات بڑے ذوق وشوق سے باقاعدہ فرمائش کر کے سنا کرتے، اور سنانے والے حضرت والد صاحبؒ ہوں یا حضرت بنوریؒ ہم خدام کے لیے تو ہر حال میں چاندی ہی چاندی تھی، اللہ اکبر، یہ پر کیف نورانی مجلسیں کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے خواب وخیال ہو گئیں، حضرت والد صاحبؒ ان محفلوں میں اکثر اپنے اساتذہ کا ذکر فرما کر عجیب کیف کے عالم میں یہ مصرع پڑھا کرتے تھے کہ:

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

کسے خبر تھی کہ چند ہی سالوں میں یہ محفلیں بھی برخاست ہونے والی ہیں!

غرض علمی اور اجتماعی مسائل میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا اشتراک عمل ہم خدام کے لیے گوناگوں فوائد کا دروازہ بن گیا، اکثر و بیشتر اجتماعی مسائل میں کوئی تحریر لکھی جاتی تو وہ حضرت والد صاحب اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع ہوتی، اور اس کا مسودہ تیار کرنے کا مرحلہ آتا تو ہم خدام میں سے کسی کو اس کے لیے مامور کیا جاتا اور بسا اوقات قرعہ فال احقر کے نام پڑتا، مسودے کو جب ان بزرگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور یہ حضرات اس کی عبارت میں کوئی

اصلاح فرماتے تو اس سے نت نئے آداب وفوائد حاصل ہوتے تھے اور جب کسی تحریر پر ان حضرات کی طرف سے دعائیں ملتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ دنیا و مافیہا کی تمام نعمتیں دامن میں جمع ہو گئی ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اور حضرت بنوریؒ کی وجہ سے کراچی کو پورے ملک میں علمی اور دینی اعتبار سے مرکزیت حاصل تھی، چنانچہ جب کوئی اجتماعی مسئلہ اٹھتا اطراف ملک سے اہل علم کراچی کا رخ کرتے تھے، اس طرح ان حضرات کے طفیل ملک بھر کے اہل علم و دین سے نیاز حاصل ہوتا رہتا تھا، پچھلے سال جب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا حادثہ پیش آیا تو اس مرکزیت کا ایک زبردست ستون گر گیا، حضرت بنوریؒ اس وقت سکھر میں تھے اور تقریباً سو ۱۰۰ میل کا سفر کر کے کراچی کے لیے طیارہ پکڑنا چاہا، لیکن سیٹ نہ مل سکی، اور نماز جنازہ اور تدفین میں شامل نہ ہو سکے۔ بعد میں جب تعزیت کے لیے تشریف لائے تو وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے، اور زبان پر بار بار بے اختیار یہ جملہ تھا کہ "اب ہم مشورے کے لیے کہاں جائیں گے؟" کسے معلوم تھا کہ مولاناؒ کا یہ اضطراب صرف سال بھر کا ہے، اور آئندہ سال اسی مہینے میں کراچی کی دینی مرکزیت کا یہ دوسرا ستون بھی گر جائے گا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت بنوریؒ کی ذات ہم سب کے لیے ایک عظیم سہارا تھی آہ! کہ اب یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا، اب ملک کے دوسرے حصوں کی طرح کراچی میں بھی سناٹا ہی سناٹا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت بنوریؒ کی وفات یوں تو پوری ملت کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، لیکن احقر اور برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم کے لیے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے مولاناؒ کے قریبی اعزہ کے لیے، اس لیے کہ وہ ہم پر اس درجہ شفیق اور مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعے ان کا بیان ممکن نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے بیس سال تک

حضرت مولانا کی صحبتیں عطا فرمائیں، صرف علمی محفلوں ہی میں نہیں، نجی مجلسوں اور سفر وسفر میں بھی مولانا کی معیت نصیب ہوئی، مولانا کی شفقتوں کا عالم یہ تھا کہ وہ ہماری کمسنی کا لحاظ کرتے ہوئے خود بھی بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مشرقی پاکستان کا ایک ساتھ تبلیغی سفر کیا، یہ ناکارہ بھی ہمراہ تھا، سلہٹ میں ہمارا قیام مجد الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے محی السنۃ صاحب کے یہاں تھا، سلہٹ بڑا سرسبز و شاداب اور خوبصورت علاقہ ہے، لیکن یہاں پہنچنے کے بعد مسلسل علمی اور تبلیغی مجلسوں کا ایسا تانتا بندھا کہ جس کمرے میں آ کر اُترے تھے، وہاں سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملا، یہاں تک کہ جب اگلے دن فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی کمرے میں اپنے وظائف واوراد کے معمولات میں مشغول ہو گئے، اور حضرت بنوریؒ نے بھی اپنے وظائف شروع کر دیے، میں اس انتظار میں تھا کہ ذرا مہلت ملے تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے کر کہیں ہوا خوری کے لیے باہر چلا جاؤں، مولانا نے میرا یہ ارادہ بھانپ لیا، اور خود ہی بلا کر پوچھا: ''کیا باہر جانا چاہتے ہو؟'' مجھے مولانا نے بے تکلف بنایا ہوا تھا، میں نے عرض کیا: ''حضرت! ارادہ تو ہے، مگر آپ بھی تشریف لے چلیں تو بات بنے۔'' بس یہ سننا تھا کہ مولانا اپنے معمولات کو مختصر کر کے تیار ہو گئے، اور خود ہی حضرت والد صاحبؒ سے فرمایا: ذرا میں تقی میاں کو سیر کرا لاؤں۔'' چنانچہ باہر نکلے اور تقریباً گھنٹہ بھر تک مولاناؒ اس ناکارہ کے ساتھ کبھی چائے کے باغات میں، کبھی شہر کے اونچے اونچے ٹیلوں پر گھومتے رہے، سلہٹ کے علاقے میں نباتات اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ایک گز زمین بھی خشک تلاش کرنی مشکل ہے، مولاناؒ جب کوئی خاص پودا دیکھتے تو اس کے بارے میں معلومات کا ایک دریا بہنا شروع ہو جاتا، اس پودے کا اردو میں یہ نام ہے، عربی میں یہ نام ہے، فارسی اور پشتو میں فلاں نام ہے، اور اس کے یہ یہ خصائص ہیں غرض

یہ تفریح بھی ایک دلچسپ درس میں تبدیل ہو گئی۔

مجھے بعد میں خیال بھی ہوا کہ مولاناؒ کے گھٹنوں میں تکلیف ہے اور میں نے خوامخواہ مولاناؒ کو زحمت دی چنانچہ میں نے کئی بار اپنی جسارت پر معذرت کی، لیکن مولاناؒ ہر بار یہ فرماتے کہ مناظرِ قدرت اللہ کا بہت بڑا عطیہ ہیں اور انہیں دیکھ کر نشاط حاصل کرنے کا شوق انسان کا فطری تقاضا ہے، تمہاری وجہ سے میں بھی ان مناظر سے محظوظ ہو گیا، اور پھر جتنے دن سلہٹ میں رہے، روزانہ فجر کے بعد یہ معمول بن گیا، مولاناؒ کے زیر سایہ سلہٹ کی یہ سیر تفریح کی تفریح ہوتی، اور درس کا درس ہوتا، مولاناؒ کو معلوم تھا کہ احقر کو عربی ادب سے لگاؤ ہے، اس لیے مولاناؒ اس دوران عربی ادب کے لطائف وظرائف بیان فرماتے، نادر اشعار سناتے، شعراءِ عرب کے درمیان محاکمہ فرماتے اور اس تفریح میں نظروں کے ساتھ قلب وروح بھی شاداب ہو کر لوٹتے تھے۔

اس طرح ایک مرتبہ برادرِ محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم ڈھاکہ میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ تھے مولانا بھی تشریف فرما تھے، مولاناؒ نے خود بھائی صاحب سے فرمایا کہ ''چلو، تمہیں چاٹگام کی سیر کرالاؤں'' چنانچہ حضرت والد صاحب سے اجازت لے کر مولاناؒ اور بھائی صاحب ڈھاکہ سے چاٹگام روانہ ہو گئے، ریل میں جگہ تنگ تھی، اور ایک ہی آدمی کے لیٹنے کی گنجائش تھی، مولاناؒ نے بھائی صاحب کو لیٹنے کا حکم دیا، لیکن بھائی صاحب نہ مانے، تو انہیں زبردستی لٹادیا، اور خود ان کی ٹانگوں کو اس زور سے پکڑ کر ان کے پاؤں کی طرف لیٹ گئے کہ وہ اٹھ نہ سکیں اپنے ایک شاگرد کے ساتھ یہ معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اللہ نے حقیقی تواضع کے مقام بلند سے سرفراز کیا ہو۔

مولاناؒ کی شفقتوں کا کہاں تک شمار کیا جا سکتا ہے؟ بفضلہ تعالیٰ ان کے ساتھ بہت سے سفروں میں بھی رفاقت نصیب ہوئی اور ہر سفر مولاناؒ کی محبت وعظمت اور عقیدت میں کئی گنا اضافہ کر کے ختم ہوا، اپنے رفقاء کے ساتھ مولاناؒ کا طرزِ عمل حیرت انگیز حد تک

مشفقانہ ہوتا تھا، اور اس ناچیز کے ساتھ تو مولانا بالکل ایسا معاملہ فرماتے تھے اور احقر کا ایسی باریک بینی کے ساتھ خیال رکھتے تھے جیسے کوئی باپ اپنے کمسن بچے کا خیال رکھتا ہو رمضان ۱۳۹۵ھ میں جب مولانا افریقہ کے سفر پر جانے لگے تو احقر کو بھی رفاقت کا شرف عطا فرمایا۔ ہم پہلے حجاز گئے، اور اللہ تعالیٰ نے حجاز تک حضرت والد صاحبؒ کی معیت بھی نصیب فرمادی، لیکن حضرت والد صاحبؒ اخیر رمضان میں واپس کراچی تشریف لے آئے، اور احقر حضرت بنوریؒ کے ساتھ حجاز میں ٹھہر گیا، ان دنوں حضرت والد صاحبؒ کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے میں صبح و شام انتہائی فکر مند رہتا تھا کہ بھوک اڑ گئی تھی، مولاناؒ کو احساس تھا کہ حضرت والد صاحبؒ سے جدائی احقر کے لیے انتہائی صبر آزما ہے، وہ خود فرماتے تھے کہ ''میں جانتا ہوں، تمہیں اپنے والد سے عشق ہے'' اس لیے مولاناؒ اپنی شگفتہ مزاجی سے میری فکر کو زائل کرنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے۔

اس کے بعد ہم نیروبی پہنچے تو وہاں کی آب و ہوا قدرتی مناظر اور خنک موسم سے میری صحت پر اچھا اثر ہوا، ادھر حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی صحت کی خبر بھی مل گئی تھی اس لیے میری طبیعت میں قدرے شگفتگی اور نشاط پیدا ہوگیا، اسی دوران ایک دوپہر کو ہم کھانے پر بیٹھے تھے، میرے اور مولاناؒ کے درمیان دو آدمی حائل تھے، کھانے کے بعد جب احقر مولاناؒ کے کمرے میں پہنچا تو فرمانے لگے، ''آج مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے''، میں نے عرض کیا، ''کیوں؟'' فرمایا ''آج کے کھانے پر تم نے رغبت کے ساتھ دو سے زیادہ روٹیاں کھائی ہیں۔''

مولانا کا یہ جواب سن کر میں دنگ رہ گیا اللہ اکبر! مولانا اپنے ایک ناکارہ خادم کے بارے میں یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ اس کی بھوک اور خوراک میں کیا کمی اور کیا اضافہ ہو رہا ہے؟ اور یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، اگر میں مولاناؒ کے ساتھ کیے ہوئے سفروں کے واقعات لکھنے شروع کردوں تو ایک مفصل مقالہ صرف اس کے لیے چاہیے۔ احقر

نے افریقہ سے واپسی پر حضرت والد صاحبؒ سے مولاناؒ کی اس قسم کی رعایتوں کا ذکر کیا تو حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: ''یہ وصف صرف کتابیں پڑھنے سے انسان میں پیدا نہیں ہوتا، یہ جوہر بزرگوں کی صحبت سے ملتا ہے''۔

یوں تو احقر مولاناؒ کا شاگرد ہی تھا، اور ہر ملاقات میں مولاناؒ سے کوئی نہ کوئی علمی فائدہ حاصل ہو جاتا تھا، لیکن ان سے باقاعدہ کوئی کتاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، احقر نے کئی بار خواہش ظاہر کی تو مولاناؒ طرح دے گئے، افریقہ کے سفر میں احقر نے مدینہ طیبہ سے اصول حدیث پر حافظ ابن کثیرؒ کی ایک کتاب ''الباعث الحثیث'' خرید لی تھی، احقر نے عرض کیا کہ میں یہ کتاب آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، مولاناؒ شروع میں اپنی تواضع کے سبب انکار فرماتے رہے، بالآخر احقر نے ایک روز فجر کے بعد مولاناؒ سے عرض کیا کہ ''میں اس کتاب کی عبارت آپ کے سامنے پڑھنے پر اکتفا کروں گا، اس پر مولاناؒ راضی ہو گئے میں جانتا تھا کہ جب بات چھڑے گی تو مولاناؒ خاموش نہ رہ سکیں گے چنانچہ احقر نے عبارت پڑھنی شروع کی، بس پھر مولاناؒ کھل گئے، اور تقریباً کتاب کے ہر فقرے پر کچھ نہ کچھ نئے افادات بیان فرمائے، افسوس ہے کہ حضرت والد صاحبؒ کی علالت کی بنا پر مجھے افریقہ سے جلد واپس آنا پڑا، اور یہ کتاب مولاناؒ کے سامنے مکمل نہ ہو سکی، لیکن بحمد اللہ اس طرح ضابطے کا تلمذ بھی مولاناؒ سے حاصل ہو گیا، مندرجہ ذیل باتیں جو مولاناؒ نے اس درس میں بیان فرمائی تھیں، اب تک یاد ہیں۔

(۱) حافظ ابن کثیرؒ اگرچہ مسلکاً شافعی ہیں، لیکن علامہ ابن تیمیہؒ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کے متعدد تفردات میں ان کے ہم نوا ہیں، مثلاً شدِ رحال کے مسئلے میں۔

(۲) علماء حدیث کا اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کون سی سند اصح الاسانید ہے، امام احمدؒ نے ''زهری عن سالم عن ابیه'' کو اصح الاسانید قرار دیا ہے۔ علی ابن المدینی نے ''محمد بن سیرین عن عبیدة عن علی'' کو مانا ہے، اور یحیٰی بن معینؒ

نے "اعمش عن ابرٰھیم عن علقمه عن ابن مسعود" کو، لیکن درحقیقت ان میں سے کسی کو علی الاطلاق اصح الاسانید کہنا مشکل ہے، درحقیقت اقوال کا یہ اختلاف اپنے اپنے علاقوں کی وجہ سے ہے، امام احمدؒ کا قول اہل مدینہ کے لحاظ سے درست ہے، علی ابن المدینیؒ کا قول بصرہ کے لحاظ سے صحیح ہے، اور یحیٰی بن معینؒ کا قول اہل کوفہ کے لحاظ سے، اس کے علاوہ بھی اس درس کی بعض باتیں احقر کے پاس لکھی ہوئی محفوظ ہیں۔

احقر پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان یہ تھا کہ جب سے البلاغ شائع ہونا شروع ہوا، وہ احقر کی تحریروں پر عام طور سے ایک سرسری نظر ضرور ڈال لیتے تھے، اور ملاقات کے وقت کوئی قابل اصلاح بات ہوتی تو اس پر تنبیہ بھی فرمادیتے، اور کوئی بات پسند آتی تو اس پر حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور یہ بات احقر کے لیے مایہ صد افتخار ہے کہ حضرت مولاناؒ نے البلاغ کی تحریروں پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اپنی تصنیف "معارف السنن" کا ایک سیٹ احقر کو بطور انعام عطا فرمایا جس کی پہلی جلد پر اپنے قلم سے یہ عبارت نہایت پاکیزہ خط میں تحریر فرمائی:

"أقدّم هذا الكتاب بأجزائه الستة المطبوعة الى أخى فى الله الأستاذ الزكىّ والعالم الذكى الشاب التقى محمّد تقى إعجاباً بنبوغه فى كتابات مجلّة الشهرية "البلاغ" خصوصاً فى ردّه على كتاب "خلافت و ملوكيت" ردّا بليغاً ناجعا حفظه الله ووفقّه لا مثال امثالهٰ وهو الموفق"

کتبه: محمد يوسف البنوری

۹۱/۳/۲٦ھ

جہاں تک کتابی علم کا تعلق ہے، دنیا میں اب بھی اس کی کمی نہیں، نہ جانے کتنے بڑے بڑے محققین آج بھی موجود ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اکابر علمائے دیوبند کو جو

خصوصیت عطا فرمائی تھی وہ یہی تھی کہ علم وفضل کا دریائے ناپیدا کنار ہونے کے باوجود ان کی ادا ادا سادگی اور تواضع میں ڈوبی ہوئی تھی، حضرت مولانا بنوریؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے مشائخ کی اس میراث سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان کے عظیم کاموں کا راز درحقیقت ان کے اخلاص، ان کی للّٰہیت ان کی سادگی و بے تکلفی اور ان کی تواضع میں تھا۔

مولاناؒ کے عملی کارناموں میں سب سے نمایاں کارنامہ تحریک ختم نبوت کی کامیاب قیادت تھی، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سالہا سال سے چلا آرہا تھا، اور ۱۹۵۳ء میں ہزارہا مسلمانوں نے اس کے لیے عظیم قربانیاں دی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو سرکاری اور قانونی سطح پر ۱۹۷۴ء کی جس تحریک کے ذریعے حل کرایا اس کے قائد مولانا بنوریؒ تھے، اس تحریک کے دوران احقر کو مولاناؒ کے ساتھ کئی سفروں میں ساتھ رہنے کا موقع ملا، اور احقر نے ان کے جس طرز عمل کا مشاہدہ کیا اس کے پیش نظر احقر کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ انشاء اللہ یہ تحریک ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

کوئٹہ کے سفر میں احقر مولاناؒ کے ہمراہ تھا، جہاں مولانا کو کل چوبیس گھنٹہ ٹھہرنا تھا جس میں تین مجلسوں سے خطاب کرنا تھا، ایک پریس کانفرنس تھی، گورنر بلوچستان سے ملاقات تھی اور عشاء کے بعد جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ عام تھا، سارے دن مولاناؒ کو ایک لمحہ بھی آرام نہ مل سکا اور رات کو جب ہم جلسۂ عام سے فارغ ہو کر آئے تو بارہ بج چکے تھے، خود میں تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا مولاناؒ تو یقیناً مجھ سے زیادہ تھکے ہوئے ہوں گے، میں نے بارہا کوشش کی تھی کہ مولاناؒ کبھی جسمانی خدمت کا موقعہ دے دیں، لیکن وہ ہمیشہ سے انکار فرمادیتے تھے، اُس رات احقر نے کچھ ایسے ملتجیانہ انداز میں مولاناؒ سے پاؤں دبانے کی اجازت چاہی کہ مولاناؒ کو رحم آ گیا، اور انہوں نے اجازت دے دی، لیکن یہ محض میری خاطر داری تھی، چنانچہ ہر تھوڑی دیر بعد وہ کچھ دعائیں دے کر پاؤں سمیٹنے کی کوشش کرتے، بالآخر میں نے جب محسوس کیا کہ ان کو پاؤں دبوانے کی راحت

سے زیادہ طبیعت پر بار ہو رہا ہے تو میں نے چھوڑ دیا، اس کے بعد میں سو گیا، رات کے آخری حصے میں آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چار پائی خالی ہے اور وہ قریب بچھے ہوئے ایک مصلّے پر سجدے میں پڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں، اللہ اکبر! ایسے سفر، اتنے تکان اور اتنی مصروفیات میں بھی ان کا نالۂ نیم شبی جاری تھا، یہ دیکھ کر مجھے ایک تو ندامت ہوئی کہ مولانا اپنے ضعف، علالت اور سفر کے باوجود بیدار ہیں اور ہم صحت اور نوعمری کے باوجود محوِ خواب! اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہوا کہ جس تحریک کے قائد کا رشتہ ایسے ہنگامۂ دارو گیر میں بھی اپنے رب کے ساتھ اتنا مستحکم ہو ان شاء اللہ وہ ناکام نہیں ہوگی۔

اس زمانے میں ملک بھر میں مولانا کا طوطی بول رہا تھا، اخبارات مولانا کی سرگرمیوں سے خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے، اور ان کی تقریریں اور بیانات شہ سرخیوں سے شائع ہوتے تھے، چنانچہ جب صبح ہوئی تو میز بانوں نے اخبارات کا ایک پلندہ لاکر مولانا کے سامنے رکھ دیا، یہ اخبارات مولانا کے سفر کوئٹہ کی خبروں، بیانات، تقریروں اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے، مولانا نے یہ اخبارات اٹھا کر ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر فوراً ہی انہیں ایک طرف رکھ دیا، اس کے بعد جب کمرے میں کوئی نہ رہا تو احقر سے فرمایا: ''آج کل جو تحریک دین کے لیے چلائی جائے اس میں سب سے بڑا فتنہ نام و نمود کا فتنہ ہے، یہ فتنہ دینی تحریکوں کو تباہ کر ڈالتا ہے، مجھے بار بار یہ ڈر لگتا ہے کہ میں اس فتنہ کا شکار نہ ہو جاؤں، اور اس طرح یہ تحریک نہ ڈوب جائے، دعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس فتنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے، ورنہ یہ ہمارے اعمال کو تو بے وزن بنا ہی دے گا اس مقدس تحریک کو بھی لے کر بیٹھ جائے گا۔''

یہ بات فرماتے ہوئے مولانا کے چہرہ پر کسی تصنع یا تکلف کے آثار نہ تھے، بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی تشویش نمایاں تھی! مولانا بنوریؒ کے علم و فضل اور دین کے لیے ان کی جدوجہد کے حالات تو ان شاء اللہ بہت لکھے جائیں گے، لیکن مولانا بنوریؒ کے

اصلی کمالات یہ تھے جو انہیں اپنے بزرگوں کی خدمت وصحبت سے حاصل ہوئے تھے، خوف و خشیت، بیم ورجاء، اخبات وانابت اور اخلاص وللّٰہیت کی یہ صفات تھیں جنہوں نے ان کو مقبولیت کے اس مقام بلند تک پہنچایا اور جنہوں نے ان کے کاموں میں برکت اور ان کی جدوجہد کو کامیابی عطا کی، رحمہ اللہ تعالی و طیب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ!

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہم لوگوں کے لیے زندگی کا سب سے بڑا دھکا اور سب سے بڑا حادثہ تھا، اس حادثے پر جن بزرگوں نے سرپرستی فرما کر ہم لوگوں کی ڈھارس بندھائی ان میں ہمارے مرشد ومربی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٰ صاحب عارفی (متعنا اللہ بطول حیاتہ بالعافیۃ) حال صدر دارالعلوم کراچی کے احسانات تو بے حدوحساب ہیں ہی، اللہ تعالیٰ ان کے فیوض سے تادیر مستفید ہونے کی توفیق کامل مرحمت فرمائے آمین، لیکن مدارس کے ماحول میں حضرت بنوریؒ کی ذات ہمارے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم العالی کو دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری قبول کرنے میں بڑا تردد تھا، اس موقع پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب کو بلا کر باصرار فرمایا کہ یہ فریضہ آپ ہی پر عائد ہوتا ہے، اور آپ ہی اسے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک مہتمم مدرسہ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کے بارے میں ایسے زریں رہنما اصول بھائی صاحب مدظلہم کو بتلائے جو مولاناؒ کے تجربات کا نچوڑ تھے، اور اب تک بھائی صاحب کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ سے مولاناؒ کو جو تعلق تھا، مولاناؒ نے آخر دم تک اس کا حق ادا کیا، وقتاً فوقتاً دارالعلوم تشریف لا کر رہنمائی فرماتے رہے ایک مرتبہ تو بغیر کسی سابقہ اطلاع کے تشریف لے آئے جس کی مسرت وحلاوت اب تک محسوس ہو رہی ہے، بلکہ یہ بھی

ارادہ ظاہر فرمایا کہ میں مہینے میں کم از کم ایک دن دارالعلوم میں گزارنا چاہتا ہوں، گو ناگوں مصروفیات کے سبب پھر اس کا تو موقع نہ مل سکا لیکن ان کی توجہات اور عنایتیں مسلسل اہل دارالعلوم کو حاصل رہیں، حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد بخاری شریف کا افتتاح بھی مولاناؒ نے کرایا۔

اور ابھی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے جب دارالعلوم کا آغاز ہو رہا تھا تو برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی نے مولاناؒ سے فون پر عرض کیا کہ ''حضرت! اب تو ہمیں آپ سے بخاری شریف کا افتتاح کرانے کی عادت ہوگئی ہے'' جواب میں پہلے تو مزاحاً فرمایا کہ: ''لیکن التزام تو مستحبات کا بھی واجب الترک ہو جاتا ہے، اور آپ تو فقہاء ہیں'' بھائی صاحب نے فرمایا ''حضرت یہ التزام نہیں، اعتیاد ہے'' فرمانے لگے کہ ''اگر آپ نہ کہتے تب بھی میری خواہش یہی ہوتی'' بھائی صاحب نے عرض کیا کہ ''صبح نو بجے ان شاء اللہ گاڑی پہنچ جائے گی، لیکن ہمارے پاس سوزوکی ہے، اور اسے حضرتؒ کے پاس بھیجتے ہوئے ندامت ہوتی ہے کہ اس میں آپ کو (گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے) زحمت ہوتی ہے'' فرمانے لگے نہیں، نہیں! وہ تو بڑی آرام دہ گاڑی ہے، آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں'' شام کو بھائی صاحب نے احقر سے فرمایا کہ مولاناؒ سے دوپہر کے کھانے کی بھی درخواست کردوں، چنانچہ احقر نے فون پر عرض کیا کہ ''اگر افتتاح بخاری کے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی یہیں ہو جائے تو مزید کرم ہو'' فرمایا: ''کچھ حرج نہیں، البتہ میرے ساتھ مدینہ طیبہ کے شیخ عبدالقادر بھی ہوں گے، ان کے لیے بغیر مرچ کا کھانا بنوالینا، اور مجھے چونکہ پرہیز ہے اس لیے تھوڑی سی یخنی بنوالینا مگر بس تھوڑی سی ہو "لقیمات یقمن صلبه" (چند چھوٹے سے نوالے لینے ہیں جو پشت سیدھی رکھ سکیں) مولاناؒ نے یہ فرمائش کرکے مزید دل خوش کردیا۔

دوشنبہ ۲۵ شوال ۱۳۹۷ھ کو مولاناؒ تشریف لائے طبیعت بحال نہ تھی، اور چلنا

پھرنا تو عرصہ سے دو بھر تھا، لیکن نہایت شگفتگی کے ساتھ تشریف فرما ہوئے، اور فرمانے لگے کہ محض تحلۃً للقسم تھوڑا سا بیان کردوں گا زیادہ کی ہمت نہیں، لیکن جب درس شروع ہوا تو طبیعت کھل گئی اور تقریباً ایک گھنٹہ تدوینِ حدیث کے موضوع پر بڑی فاضلانہ تقریر فرمائی، جس کا خلاصہ اسی شمارے میں عزیزم مولوی شیخ رحیم الدین سلمہ، کے قلم سے الگ شائع ہورہا ہے، درس کے بعد دیر تک حاضرین کو اپنے علمی لطائف وظرائف سے محظوظ فرماتے رہے، اسی دوران ہم نے چائے کے لیے درخواست کی تو فرمایا کہ ''خفیف قسم کی چائے بنوالو'' لیکن پھر خود ہی فرمایا کہ ''خفیف ہونے کا فیصلہ کون کرے گا! لہذا چائے بنانے والے سے کہو کہ وہ پتیلی میں پانی جوش دے کر یہیں لے آئے، پتی میں خود ڈالوں گا'' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تمام چیزوں کی طرح چائے کے بارے میں بھی مولاناؒ کا ذوق بڑا نفیس تھا، فرمایا کرتے تھے کہ اچھی چائے کی تین خصوصیات ہیں، لب دوز ہو، لب سوز ہو اور لبریز ہو۔

چائے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر تشریف لے گئے، اور واپس آکر دوپہر کا کھانا تناول فرمایا، برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی پاس بیٹھے تھے، وہ جس جس چیز کے تناول فرمانے کی درخواست کرتے، مولاناؒ لے لیتے، کسے معلوم تھا کہ دارالعلوم میں آخری بار مولاناؒ کی خاطر داری ہورہی ہے، اور ایک ہفتہ بعد ٹھیک اسی دن اور اسی وقت مولاناؒ ملاءِ اعلیٰ کی مہمانی کے لیے تیار ہورہے ہوں گے!

اسی روز مولاناؒ نے احقر سے پوچھا! ''اسلامی مشاورتی کونسل کا اجلاس جمعرات کو ہے، کب چلو گے؟'' احقر نے عرض کیا: ''جب آپ تشریف لے جائیں'' فرمایا: ''میں نے جمعرات کو صبح آٹھ بجے کے طیارے سے سیٹ بک کرالی ہے'' میں نے عرض کیا: ''میں بھی اسی سے بکنگ کرالیتا ہوں'' اس طرح مولاناؒ کے آخری سفر میں بھی اللہ تعالیٰ نے احقر کو رفاقت کا شرف عطا فرمایا۔

جمعرات آئی، صبح کو میں ایئر پورٹ پہنچا تو مولاناؒ تشریف نہیں لائے تھے، میں دروازے پر انتظار کرتا رہا تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لائے، کچھ دنوں سے عام طور پر حضرت بنوریؒ کے ساتھ سفر میں مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب ہوا کرتے تھے، لیکن اس بار وہ صرف پہنچانے کے لیے آئے، اور ساتھ جانے کے لیے حضرتؒ کے صاحبزادے مولانا محمد بنوری صاحب سلمہ تھے، طیارے میں ہم ساتھ چڑھے میں نے اور مولانا محمد صاحب نے مولانا کو اپنے کندھے کا سہارا کرنا چاہا، لیکن وہ جہاز کی سیڑھیوں کی دورویہ دیواروں سے سہارا لے کر چڑھتے رہے، کسے معلوم تھا کہ یہ مولاناؒ کا آخری سفر ہے، اور اسی لیے قدرت نے اس سفر میں خلاف معمول ان کے صاحبزادے کو ساتھ کر دیا ہے بظاہر طیارہ راولپنڈی جا رہا تھا اور مولاناؒ کو اسلام آباد جانا تھا، لیکن یہ کون جانے کہ مولاناؒ کی منزلِ مقصود اسلام آباد سے بہت آگے ہے، اور وہ اس سفر پر روانہ ہو رہے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر دنیا میں نہیں آتا، ہمارے کان تو فضائی عملے کا صرف یہ اعلان سن رہے تھے کہ پچیس منٹ میں اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچے گا'' لیکن یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ مولانا کے لیے یہ کہیں اور سے بلاوا آیا ہے

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

مولاناؒ کو سفر میں چونکہ معاون کی ضرورت ہوتی تھی، اس لیے وہ اسلامی کونسل کے اجلاس میں اپنے کسی رفیق کو اپنے خرچ پر ساتھ لے جاتے تھے، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ ''حضرت آئندہ آپ کو اپنی خدمت کے لیے کسی کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں، میں ساتھ موجود ہوتا ہوں، اور مجھے علیٰحدہ کمرے میں قیام کی بھی ضرورت نہیں، میں آپ ہی کے کمرے میں آپ کے ساتھ ٹھہر جایا کروں گا، اور اس طرح مجھے بھی تحصیل سعادت کا موقع مل جائے گا'' مولاناؒ اس پر مسرور تو ہوئے، لیکن فرمایا: ''آپ کو اس نیت کا ثواب مل

گیا،نیۃ المرء خیر من عملہ (انسان کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) میں ابھی اپنا کام خود کر لیتا ہوں، میں نے اس وقت زیادہ اصرار نہ کیا کہ آئندہ سفر کے موقع پر دیکھا جائے گا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ قدرت یہ الہامی الفاظ زبان سے ادا کرا رہی ہے، اور احقر کی اس نیت کو نیت ہی رہنا ہے، اس کے ملبوسِ عمل ہونے کی نوبت کبھی نہ آسکے گی۔

طیارے میں مولانا حسب معمول شگفتہ رہے، اور جمعرات کا دن بھی ہشاش بشاش رہ کر گزارا، اس روز کونسل کی دو نشستیں تھیں، مولانا نے دونوں میں بھر پور حصہ لیا، جمعہ کی صبح تیسری نشست تھی اس میں مولانا نے کونسل میں ایک نہایت اصولی، مختصر، مگر جامع تقریر فرمائی جو مولانا کی آخری تقریر تھی کونسل کی نشستوں میں ایجنڈے سے باہر کی باتیں بھی بعض اوقات چھڑ جاتی ہیں، اسی سلسلہ میں دراصل ہوا یہ تھا کہ بعض حضرات نے مولانا سے فرمائش کی تھی کہ وہ ٹیلی ویژن پر خطاب فرمائیں، مولانا نے ریڈیو پر خطاب کرنے کو تو قبول کرلیا تھا، لیکن ٹیلی ویژن پر خطاب کرنے سے معذرت فرمادی تھی کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے، اسی دوران غیر رسمی طور پر یہ گفتگو بھی آئی تھی کہ فلموں کو مخرب اخلاق عناصر سے پاک کر کے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا:

> ''اس سلسلہ میں میں ایک اصولی بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، لوگوں کو پکا مسلمان بنا کر چھوڑیں، ہاں اس بات کے مکلف ضرور ہیں کہ تبلیغ دین کے لیے جتنے جائز ذرائع ''وسائل ہمارے بس میں ہیں ان کو اختیار کر کے اپنی پوری کوشش صرف کردیں، اسلام نے ہمیں جہاں تبلیغ کا حکم دیا ہے وہاں تبلیغ کے باوقار طریقے اور آداب بھی بتائے ہیں، ہم ان طریقوں اور آداب کے دائرے میں رہ کر تبلیغ

کے مکلف ہیں، اگر ان جائز ذرائع اور تبلیغ کے ان آداب کے ساتھ ہم اپنی تبلیغی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں تو عین مراد ہے، لیکن اگر بالفرض ان جائز ذرائع سے ہمیں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ہم اس بات کے مکلّف نہیں ہیں کہ ناجائز ذرائع اختیار کر کے لوگوں کو دین کی دعوت دیں، اور آداب تبلیغ کو پس پشت ڈال کر جس جائز و ناجائز طریقے سے ممکن ہو، لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کریں، اگر ہم جائز وسائل کے ذریعے اور آداب تبلیغ کے ساتھ ہم ایک شخص کو بھی دین کا پابند بنادیں گے تو ہماری تبلیغ کامیاب ہے، اور اگر ناجائز ذرائع اختیار کر کے ہم سو (۱۰۰) آدمیوں کو بھی اپنی ہم نوا بنالیں تو اس کامیابی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں کیونکہ دین کے احکام کو پامال کر کے جو تبلیغ کی جائے گی وہ دین کی نہیں کسی اور چیز کی تبلیغ ہوگی، فلم اپنے مزاج کے لحاظ سے بذاتِ خود اسلام کے حکام کے خلاف ہے، لہٰذا ہم اس کے ذریعے تبلیغ دین کے مکلّف نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص جائز اور باوقار طریقوں سے ہماری دعوت کو قبول کرتا ہے تو ہمارے دیدہ دل اس کے لیے فرش راہ ہیں لیکن جو شخص فلم دیکھے بغیر دین کی بات سننے کے لیے تیار نہ ہو اسے فلم کے ذریعے دعوت دینے سے ہم معذور ہیں، اگر ہم یہ موقف اختیار نہ کریں تو آج ہم لوگوں کے مزاج کی رعایت سے فلم کو تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے کل بے حجاب خواتین کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا، اور رقص و سرود کی محفلوں سے لوگوں کو دین کی طرف بلانے کی کوشش کی جائے گی، اس طرح ہم تبلیغ کے نام پر خود دین کے ایک ایک حکم کو پامال کرنے کے مرتکب ہوں گے۔''

یہ کونسل میں مولانا کی آخری تقریر تھی، اور غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے مولانا کی آخری وصیت تھی جو لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

مولانا کی اس تقریر کے بعد وہ غیر رسمی گفتگو تو ختم ہوگئی، اور پھر ایجنڈے کے مطابق کارروائی ہوتی رہی جس میں مولانا نے حصہ لیا۔

شام کو کونسل کی چوتھی نشست تھی، اور اس میں بھی مولانا پورے نشاطِ طبع کے ساتھ تشریف لے گئے، جاتے ہوئے حضرت بنوریؒ کار کی اگلی نشست پر تشریف فرما تھے، اور احقر پچھلی نشست پر تھا احقر کو اجلاس میں ایک مسودہ پیش کرنا تھا، اس لیے راستے میں اس پر نظر ثانی کرنے لگا، عصر کے بعد کا وقت تھا، اور کار سبزہ وگل سے لدے ہوئے پہاڑ کے دامن میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر جارہی تھی جس کے دونوں طرف سرسبز مناظر تھے، مولانا نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں قلم ہاتھ میں لیے مسودے کی نوک پلک ٹھیک کررہا تھا، مولانا نے فرمایا، ''ایھا الشیخ الشاب[1] (نوجوان بڑے میاں) ذرا اس وقت تو یہ کام رہنے دو، باہر کی طرف دیکھو، کیسے حسین مناظر ہیں؟ ان قدرتی مناظر کا بھی کچھ حق ہے، اور یہ ان کا حق ادا کرنے کا وقت ہے'' مجھے اپنی کوتاہی کا بھی احساس ہوا، اور مولانا کی عظمت کا بھی، کہ مذاق ہی مذاق میں حق شناسی کی کیسی تعلیم دے دی، اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کو بھی عبادت بنادیا۔

کونسل میں مولانا کی آخری تشریف آوری تھی، نماز مغرب انہوں نے ہی پڑھائی اور دیر تک دعائیں کراتے رہے، مغرب کے بعد بھی دیر تک اجلاس جاری رہا اور وہ اس میں پوری شگفتگی کے ساتھ شریک رہے، عشاء کے بعد ہم واپس گورنمنٹ ہاسٹل آگئے، مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور میں اپنے کمرے میں آگیا،

ہفتے کی صبح ناشتے کے بعد مجھے مولانا کے کمرے میں جانا تھا، برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ ''الحق''، احقر کے بھتیجے مولوی محمود اشرف عثمانی سلمہ، اور عمہ

[1] مولانا جب طبعاً شگفتہ ہوتے تو اکثر احقر کو ان الفاظ سے خطاب کیا کرتے تھے۔

زادہ جناب زاہد حسن انصاری صاحب بھی میرے پاس آئے ہوئے تھے، اور رات میرے ساتھ رہے تھے، ہم سب مولاناؒ کے کمرے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا کے گلے میں کوئی تکلیف ہوئی ہے اور مولوی محمد بنوری صاحب سلمہ، ان کو معائنہ کے لیے پولی کلینک لے گئے ہیں، تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے، اور ہمیں دیکھ کر سوال کے بغیر ہی فرمادیا کہ صبح میرے گلے میں کچھ عجیب سی تکلیف ہوئی، ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ یہ دل کی تکلیف نہیں ہے، لیکن آرام کی ضرورت ہے، مولوی محمد صاحب نے مجھ سے الگ بتایا کہ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا ہے کہ دل پر معمولی دباؤ ہوا ہے، مولاناؒ کو چونکہ اس سے پہلے دل کی تکلیف ہو چکی تھی، اس لیے میرا ماتھا ٹھنکا، اور میں نے مولاناؒ سے درخواست کی کہ آج کے تمام پروگرام منسوخ کر کے مکمل آرام فرمائیں، ہم نے عرض کیا کہ ہم کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آدمی بیٹھا دیتے ہیں تا کہ کوئی اندر نہ جائے، مولاناؒ نے فرمایا کہ کچھ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان شا اللہ تھوڑے سے آرام کے بعد طبیعت بحال ہو جائے گی تھوڑی دیر بعد مولانا لیٹ گئے، اور اندازہ ہوا کہ نیند آگئی ہے، چنانچہ ہم باہر چلے آئے۔

اس روز صبح کے وقت کونسل کا کوئی اجلاس نہ تھا، بلکہ ارکان کونسل کو ادارۂ تحقیقات اسلامی کا معائنہ کرنے کے لیے جانا تھا چنانچہ دس بجے میں وہاں چلا گیا، دو بجے کے قریب میں واپس آکر اپنے کمرے میں کھڑا ہی ہوا تھا کہ مولاناؒ کے صاحبزادے کو فون آیا کہ مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہے، فوراً پہنچئے، میں اسی حالت میں مولاناؒ کے کمرے کی طرف لپکا تو مولوی محمد صاحب سلمہ، کمرے سے باہر آبدیدہ کھڑے تھے، ان کی حالت دیکھ کر مجھے سخت تشویش ہوئی، قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولاناؒ کو شدید دورہ ہوا ہے اس وقت مولاناؒ نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے تھے، اور وقفے وقفے سے کراہ رہے تھے۔

اتفاق سے اسلامی کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب بھی

اس وقت مولانا کی عیادت کے لیے پہنچ گئے تھے، میں اور وہ دونوں فوراً پولی کلینک پہنچے، ڈاکٹر صاحب وہاں موجود نہ تھے تو ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کی، جسٹس چیمہ صاحب نے ان سے مختصراً مولانا کی کیفیت بیان کی، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے مولانا سے صبح بھی درخواست کی تھی کہ وہ تین روز کے لیے ہسپتال میں داخل ہو جائیں، مگر وہ نہ مانے اب ان کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہے، آپ انہیں پولی کلینک لے آئیں، چیمہ صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ایمبولینس کا انتظام کر دیں، انہوں نے اس کا وعدہ کیا، اور ہم ہوسٹل لوٹ آئے، یہاں احقر نے جسٹس چیمہ صاحب سے عرض کیا کہ جب ہسپتال میں داخل کرنا ہے تو پولی کلینک کے بجائے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل کرنا زیادہ مناسب ہوگا، چنانچہ چیمہ صاحب نے مختلف جگہ فون کر کے وہاں داخلے کا انتظام کیا، اور وہاں سے بھی ایک ایمبولینس مولانا کو لینے کے لیے روانہ ہوگئی۔

کافی دیر گزر گئی اور دونوں میں سے کوئی ایمبولینس بھی نہ پہنچی، بار بار فون کرنے کے بعد پولی کلینک کی ایمبولینس چار بجے کے قریب آئی، چونکہ سی ایم ایچ کی ایمبولینس بھی روانہ ہو چکی تھی اور وہ زیادہ آرام دہ ہوتی ہے، اس لیے چیمہ صاحب کی رائے تھی کہ چند منٹ اس کا انتظار کر لیا جائے لیکن مولانا کی کیفیت دیکھ کر لحہ بہ لحہ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ اب مزید انتظار کا تحمل معلوم نہیں ہوتا، اس لیے جو ایمبولینس موجود ہے اسی میں چلنا چاہیے، اس دوران برادر محترم مولانا قاری سعید الرحمان صاحب (مہتمم جامعہ اسلامیہ راولپنڈی) بھی پہنچ چکے تھے جو ہمیشہ راولپنڈی میں حضرت بنوریؒ کے خصوصی میزبان ہوا کرتے تھے، اور قاری رفیق صاحب بھی آگئے تھے، جو اسلام آباد میں مولانا کے قیام کے دوران ان کی خدمت کا شرف حاصل کرتے تھے، جب ہم اسٹریچر لے کر مولانا کے قریب پہنچے تو مولانا بیدار تھے، میں نے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ برف ہو رہا تھا، اور کپڑے پسینے میں اس بری طرح شرابور تھے کہ انہیں بلا تکلف نچوڑا جا سکتا تھا،

مولاناؒ نے میری طرف دیکھا تو ایک عجیب کیفیت کے ساتھ فرمایا:

''آج کی تکلیف بالکل نئی قسم کی تکلیف ہے، اس کو ڈاکٹر نہیں سمجھ سکیں گے'' اس سے قبل دورے کی شدت کے عالم میں اپنے صاحب زادے سے بھی مولاناؒ یہی بات فرما چکے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ''اب میں جا رہا ہوں''

احقر نے عرض کیا: ''حضرت! اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ ہم پر فضل فرمائیں گے، ہم آپ کو کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لے جانا چاہتے ہیں، '' مولانا نے خود سپردگی کے عالم میں فرمایا ''جیسے آپ کی مرضی!'' جب مولانا محمد صاحب، قاری سعید الرحمن صاحب اور قاری رفیق صاحب مولاناؒ کی دائیں جانب سے انہیں اٹھانے کے لیے بڑھے تو فرمایا ''میں خود اٹھ جاؤں گا'' اور ساتھ ہی کچھ اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ اٹھا نہ گیا، ہم سب نے باصرار عرض کیا کہ ''آپ بالکل اٹھنے کی کوشش نہ کریں'' چنانچہ مولاناؒ کو اسٹریچر پر اٹھا کر ایمبولینس میں سوار کر دیا گیا، مولانا محمد صاحب، قاری سعید الرحمن صاحب اور قاری رفیق صاحب ایمبولینس میں مولاناؒ کے ساتھ بیٹھے اور مفتی سیاح الدین صاحب اور احقر چیمہ صاحب کے ساتھ ان کی کار میں ہسپتال روانہ ہوئے، راستہ بڑا طویل تھا عصر کے قریب ہم ہسپتال پہنچے، وہاں پہلے سے مولاناؒ کی تشریف آوری کی اطلاع ہو چکی تھی، اور انتہائی طبی توجہ کے شعبے (intensive care unit) میں مولانا کو داخل کر دیا گیا اس شعبے میں کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی، لیکن باہر مولاناؒ کے متعلقین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ برادر محترم مولانا قاری سعید الرحمن صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے مولانا کو راحت پہنچانے کے ممکنہ انتظامات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اگرچہ حضرت سے ملنے کی اجازت کسی کو نہ تھی، مگر قاری رفیق صاحب، اور ان کے ایک ساتھی رات کو ہسپتال ہی کے لان میں رہے، رات کی میٹنگ کے بعد فون پر احقر نے خیریت معلوم کی تو پتہ چلا کہ بحمد اللہ طبیعت بہتر ہو رہی ہے اور جسم میں گرمی بھی عود کر آئی

ہے، اس خبر پر اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا، اتوار کی صبح سویرے بھی خیریت ہی کی اطلاع ملی، اور ساتھ ہی ڈاکٹروں کا یہ ارادہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ان شاءاللہ ایک دو روز میں مولاناؒ کو آئی سی یو سے ہسپتال کے عام کمرے میں منتقل کردیں گے، اس سے مزید اطمینان ہوا، اتفاق سے اتوار کے روز کونسل کا اجلاس صبح ۹ بجے سے رات ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہا، سہ پہر کے وقت جو وقفہ ہوا اس میں بھی ایک ذیلی کمیٹی کام کرتی رہی جس میں احقر بھی شامل تھا البتہ بیچ بیچ میں ہسپتال سے مولاناؒ کی خیریت معلوم ہوتی رہی، رات کے وقت قاری سعید الرحمٰن صاحب کو مولاناؒ سے ملاقات کا موقع مل گیا، اس وقت طبیعت کافی بشاش تھی مولانا نے قاری صاحب سے باتیں بھی کیں، اور افاقے کا حال بھی بتایا۔

دوشنبہ کی صبح ناشتہ کے بعد میں ہسپتال جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا اور خیال یہ تھا کہ ان شاءاللہ مولاناؒ کو اچھی حالت میں دیکھوں گا، کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی یہ جسٹس چیمہ صاحب کا فون تھا، انہوں نے یہ دلخراش خبر سنائی کہ آج صبح مولاناؒ ہم سے رخصت ہوگئے، انّا للہ وانا الیہ راجعون۔

بیماری کے پہلے دن تشویش تو تھی، لیکن یہ بالکل اندازہ نہ تھا کہ مولاناؒ اتنی جلدی چلے جائیں گے اچانک یہ کرب انگیز خبر صاعقہ بن کر گری، ہوش وحواس قابو میں نہ رہے، افتاں خیزاں ہسپتال پہنچے تو مولاناؒ اس دارالمحن کی سرحد پار کر چکے تھے، کھلے ہوئے پرنور چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون طاری تھا جیسے ایک تھکا ہوا مسافر منزل پر پہنچ کر آسودہ ہوگیا ہو:

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ:

اللهم أكرم نزله ووسّع مد خله و أبدله دارا خير من داره و أهـلا خيـر امـن أهـلـه ونـقّه من الخطايا كما ينقّى الثوب

الأبیض من الدنس وبلّغه الدرجات العلٰی من الجنة آمین

حضرت بنوریؒ کی وفات کے ساتھ ایک پوری قرن کا خاتمہ ہوگیا، یہ حادثہ صرف مولاناؒ کے اعزہ کا نہیں پورے ملک کا پوری ملت کا، بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے اس حادثے سے دارالعلوم کراچی بھی اتنا ہی متاثر ہوا ہے جتنا مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن، اور احقر کے لیے تو متعدد جہات سے یہ ایک عظیم ذاتی سانحہ ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کے بہت سے حضرات نے اس حادثہ پر جہاں مولاناؒ کے اعزہ کے پاس تعزیتی خطوط روانہ کیے ہیں، وہاں احقر اور برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثانی صاحب کو بھی تعزیت کے لیے خطوط لکھے ہیں، میں ان حضرات کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس صدمہ جانکاہ کی نوعیت کو محسوس فرما کر اس مشکل وقت میں اظہار ہمدردی فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیے، اس لیے اس عظیم صدمے کو باوجود جس کے بعد کمر ٹوٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس بات پر ایمان ہے کہ جو کچھ ہوا وہی اللہ تعالیٰ کی حکمت کا مقتضاء تھا، اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا بنوری قدس سرہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے اور ان کے نسبی و روحانی وارثوں اور بطور خاص برادر عزیز مولانا محمد بنوری صاحب کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس صدمے پر صبرِ جمیل کے ساتھ مولاناؒ کے نقش قدم پر چل کر اس مشن کو آگے بڑھائیں جس کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے مولاناؒ نے آخر وقت تک جدوجہد جاری رکھی، اور جس کی خاطر انہوں نے غریب الوطنی میں جان دی۔

اللّٰھم لا تحرمنا أجره ولا تفتنّا بعده، انّ فیك عزاء من کلّ مصیبة وخلفا من کلّ هالك، ولا حول ولا قوّة الا بك، ولا ملجأ ولا منجا منك الا الیك.

حافظ سید رشید احمد ارشد

مولانا بنوری میری نظر میں

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم، موجودہ دور میں عالم اسلام کے ان معدودے چند علماء ومحدثین میں شامل تھے جو اس عالم فانی سے رفتہ رفتہ رخصت ہو رہے ہیں اور اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑ رہے ہیں، پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں پہلے ہی سے قحط الرّجال تھا کیوں کہ ہم اپنے مذہبی اور علمی ادارے اس علاقہ میں چھوڑ آئے تھے جو اب بھارت کے نام سے موسوم ہے البتہ چند جید علماء کرام ومشائخ عظام پاکستان آئے تھے، اور انہوں نے یہاں آکر عربی مدارس کی شکل میں مذہبی مشعلیں روشن کیں مگر جلد ہی رخصت ہو گئے، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۹ء میں یعنی پاکستان کے ابتدائی سالوں ہی میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے، اس کے بعد حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رخصت ہوئے، اور آخر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا سے محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہما بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے اور پاکستان کے مذہبی مدارس اور مذہبی مجالس کو سونا کر گئے، اور پاکستان کے مذہبی حلقے یتیم اور بے یار و مددگار ہو گئے۔

یہ ممکن ہے کہ عالم اسلام دینی اور دنیاوی علوم میں مستقبل میں ترقی کی شاہراہ پر

گامزن ہو جائے اور مادی و اقتصادی طور پر خوش حال ہو جائے، اسلامی جامعات اور یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم میں تحقیقات کرنے کے دروازے کھل جائیں، مگر ہم لوگ ایسے بوریہ نشین، قناعت پسند علماء ومحدثین کہاں سے لائیں گے جو کسی دنیاوی طمع کے بغیر اور جاہ ومنصب سے بے نیاز ہو کر ساری عمر قال اللہ اور قال الرسول کے درس میں گزار دیں اور جن کا خلوص، تقوے اور پرہیزگاری ضرب المثل ہو۔

پاکستان میں صرف چند جلیل القدر علماء اور محدثین تھے مگر وہ اسلامی ممالک بھی جو اسلامی علوم کا گہوارہ تھے اور جہاں دور دراز سے طالبان علم دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جایا کرتے تھے یہ مقامات بھی نامور علماء ومحدثین سے خالی ہو گئے ہیں، اب مصر و شام اور حجاز و عراق کے علماء کہاں باقی رہے ہیں؟ بلکہ برصغیر ہند و پاکستان کے اعلیٰ اسلامی مرکز دارالعلوم دیوبند کے نامور اساتذہ کرام بھی رخصت ہو گئے ہیں، یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس سے عالم اسلام دوچار ہے، بظاہر حالات اچھے نہیں ہیں تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور وہی دین اسلام کی حفاظت اور اس کی تبلیغ واشاعت کے لیے پردہ غیب سے سامان بہم پہنچائے گا، ان تاثرات کے بعد میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ سے اپنی ملاقات وتعلقات کا مختصر حال بیان کروں گا۔

مجھے افسوس رہا کہ میں ابتداء ہی سے کراچی میں مقیم رہا اور حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ میرے سامنے کراچی میں تشریف لائے اور جامع مسجد نیوٹاؤن میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ قائم کیا تاہم بعدِ مسافت کی وجہ سے میں ان کی صحبتوں میں زیادہ شریک نہیں ہو سکا اور ان کی مجالس میں بیٹھ کر ان کے علمی فیوض حاصل نہیں کر سکا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحبؒ کے اسم گرامی سے اس وقت روشناس ہوا جب کہ وہ دارالعلوم ڈابھیل میں تعلیم دیا کرتے تھے، آپ درس وتدریس کے

مشغلہ کے ساتھ ساتھ وہاں کی ''مجلس علمی'' کے روح رواں بھی تھے اور تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بھی رہا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے مجلسِ علمی ڈابھیل کے ماتحت مصر جاکر متعدد علمی اور کتب عربی زبان میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرائیں ایسی متعدد تصانیف میری نظر سے گزری ہیں۔

جب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ۱۹۴۹ء میں وصال ہوا تو کراچی کے ایک نوزائیدہ علمی ماہنامہ ''مستقبل'' کے مدیر محترم نے آپ کی یادگار میں ایک ضخیم ''شیخ الاسلام'' نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا، یہ ماہنامہ ''مستقبل'' حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا، اس لیے اس کے مدیر محترم کا یہ خیال تھا کہ برصغیر ہند و پاکستان کے نامور معاصر و محدثین سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے علمی کمالات پر خط و کتابت کر کے مقالات اور مضامین لکھوائے جائیں، علمائے کرام سے خط و کتابت کرنے کا کام میرے سپرد ہوا اور میں نے ہند و پاکستان کے ان نامور علمائے کرام سے خطوط کے ذریعہ درخواست کی وہ ''شیخ الاسلام نمبر'' کے لیے اپنے مقالات و مضامین بھیج دیں، مگر افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ ان میں سے صرف چند علماء کرام نے ان خطوط کے جوابات دیے، دیگر حضرات نے جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی جن علماء نے جواب دیے ان میں حضرت الاستاذ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہم شامل تھے، ان سب حضرات نے ہندوستان سے میرے خطوط کے جوابات دیے۔

چونکہ اس اثناء میں مقامی علماء اور ہند و پاکستان کے علماء کی طرف سے کوئی مقالہ موصول نہیں ہوا اس لیے شیخ الاسلام نمبر کی اشاعت نہیں ہوسکی، تاہم میں نے خطوط محفوظ کر لیے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ کے اس

کارڈ عکس شائع کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ڈابھیل (بھارت) سے جون ۱۹۵۰ء کو میرے نام بھیجا تھا۔

(مکرمی) زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا نامۂ گرامی اور ماہنامہ کا پرچہ مہینوں سے پہنچ گیا تھا، میں اتنا مشغول تھا کہ اس وقت نہ تعمیلِ حکم کر سکا نہ جواب لکھ سکا، جی چاہتا تھا کہ قدرے مفصل اپنے شیخِ محترم حضرت علامہ عثمانی مرحوم کے احوال لکھوں لیکن مفصل کے لیے فرصت نہ ملی اور معاملہ اس وقت تک تعویق میں پڑ گیا، اب تو شاید علامہ عثمانی نمبر نکل چکا ہوگا، اگر بالفرض اس وقت نہیں نکلا تو براہ کرم جلد مطلع فرمائیں، اگر کچھ خامہ فرسائی ہو سکی تو کر گزروں گا امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد یوسف بنوری، ڈابھیل ۶ جون ۱۹۵۰ء

جنابِ محترم رشید احمد صاحب ارشد

دفتر ماہنامہ مستقبل، رابسن روڈ، کراچی

یہی آپ کی پہلی اور آخری تحریری یادگار میرے پاس موجود ہے، یہ مختصر الفاظ کا معمولی خط ہے مگر اس سے آپ کے اس اعلیٰ کردار کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ نے مجھ جیسے گمنام اور ناواقف شخص کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا۔

جب آپ مستقل طور پر پاکستان تشریف لے آئے تو آپ کے ہونے والے داماد (کیوں کہ اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی) جناب مولانا محمد طاسین صاحب ناظم کتب خانہ مجلسِ علمی میری ویدر ٹاور کراچی، کے توسط سے مجلس علمی کے کتب خانہ ہی میں میری آپ سے بالمشافہ ملاقات ہوئی اور تعارف حاصل ہوا، جب آپ نے جامع مسجد

نیوٹاؤن کراچی میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ قائم کیا تو یہ خاکسار مدرسہ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں ملاقات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اور ایک دو دفعہ آپ کے درس میں بھی شریک ہوا، ان ملاقاتوں میں تمام علوم اسلامی میں آپ کی وسعتِ معلومات سے بہت متاثر ہوا۔ اسوقت مجھے اندازہ ہوا کہ آپ تمام اسلامی علوم میں جامع الکمالات ہیں اور سب سے بڑھ کر آپ کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ آپ کو عربی تحریر وتقریر میں یکساں قدرت کاملہ حاصل تھی اور آپ فی البدیہ عربی تحریر وتقریر پر قادر تھے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے آپ دمشق کی شہرہ آفاق علمی اکیڈمی ''المجمع العلمی" کے پاکستان کے اعزازی رکن تھے، یہ اہل پاکستان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے کیوں کہ تمام دنیا میں صرف چند ایسے علماء کو اس اکیڈمی کا رکن بنایا جاتا ہے جنہوں نے عربی زبان میں اسلامی علوم اور عربی ادبیات پر قابلِ قدر تحقیقاتی کتب شائع کرائی ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا بنوری نور اللہ مرقدہٗ مجھ پر بہت محبت وشفقت فرماتے تھے آپ اپنا ماہنامہ مجلّہ بینات ابتدائی زمانے ہی سے میرے نام اعزازی طور پر بھجواتے تھے جو مجھے باقاعدہ موصول ہوتا تھا اور سالہا سال تک میرے مذہبی اور تاریخی مضامین مجلّہ بینات میں شائع ہوتے رہے اور میرے بعض مضامین آپ کے زیر مطالعہ رہے اور آپ نے ان پر اظہار پسندیدگی فرمایا، چونکہ آپ ہر ماہ ''بصائر وعبر'' کے عنوان سے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرماتے تھے اور آپ کے مضامین بھی اس مجلّہ علمیہ میں شائع ہوا کرتے تھے اس لیے میں آپ کے زریں خیالات مضامین سے ہر ماہ مستفیض ہوا کرتا تھا، مجھے آپ سے ملاقاتوں کی تمام باتیں یاد نہیں ہیں تاہم آپ سے دو ملاقاتیں جنہیں آخری ملاقاتیں کہنا چاہیے، میرے دل پر نقش ہیں۔

ایک ملاقات وہ ہے جو ۱۹۷۵ء میں جب میں حج کے لیے مکہ معظمہ گیا تو میرے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں تھا کہ اس مقدس سرزمین میں میری آپ سے ملاقات ہوگی، بعد

میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب میں حج سے پیشتر زیارت کے لیے مدینہ منورہ گیا ہوا تھا تو اس زمانے میں آپ بھی مدینہ منورہ تشریف رکھتے تھے مگر لاعلمی کی وجہ سے وہاں آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی، البتہ حج کے قریب مکہ معظمہ میں میری آپ سے ملاقات اچانک اس طرح ہوئی کہ میں کسی کام کے لیے ''رابطہ عالم اسلامی'' کے دفتر میں مولوی محمد احمد قمر (قادری) صاحب سے ملاقات کے لیے پہنچا تو اسی وقت آپ کی طرف سے ان کے پاس فون آیا اور جب وہ اپنی گاڑی میں آپ کو لینے کے لیے آپ کی قیام گاہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں آپ کی ملاقات کے لیے گیا اور حج کے مبارک دنوں میں آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل کی، اس وقت آپ کے ساتھ مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب بھی تھے۔

میری آخری ملاقات غالبًا آپ سے اس وقت ہوئی جب کہ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ میں ان کے لیے آپ سے درخواست کروں کہ آپ ان کے ایک جلسہ کی صدارت قبول فرمائیں، اس وقت آپ عصر کے بعد اپنے مدرسہ کے طلبہ کے حلقہ میں جامع مسجد نیو ٹاؤن کے سبزہ زار میں تشریف فرما تھے، اس وقت مولانا محمد طاسین صاحب بھی وہاں موجود تھے، آپ نے مجھے دیکھ کر نہایت محبت وشفقت کے ساتھ مجھے اپنی مسند پر اپنے قریب بٹھالیا، میں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک جلسۂ سیرت کی صدارت قبول فرمائیں، آپ نے گھٹنوں کی تکلیف اور ضعف و پیری کی وجہ سے جلسۂ کی صدارت قبول کرنے سے معذرت کا اظہار فرمایا، تاہم میں آپ کے اس رویہ سے بہت متاثر ہوا کہ آپ جیسے جلیل القدر عالم نے میری یہ عزت افزائی کی کہ مجھے اپنی مسند پر اپنے قریب بٹھایا اور یوں علمی خدمات کا اعتراف فرمایا۔

مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ دور رہنے کی وجہ سے اور کچھ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے زیادہ مواقع حاصل نہیں

کر سکا، تاہم یہ امر میرے لیے باعث فخر و اطمینان ہے کہ میں نے آپ کی یادگار "ماہنامہ بینات" کے لیے متعدد مضامین لکھے جو ہمیشہ شائع ہوتے رہے، اس لیے آپ کے وصال کے بعد بھی یہ مختصر کلمات تحریر کیے ہیں تا کہ میرا شمار بھی آپ کے عقیدت مندوں میں ہو جائے، ورنہ آپ کے علمی کمالات اور آپکے محاسن اخلاق پر مقالات تحریر کرنا آپ کے معاصر جلیل القدر علمائے کرام اور آپ کے ان مخصوص رفقائے کار کا کام ہے جو ہمیشہ سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں ایسے صاحبانِ علم وفضل کی اور سب سے بڑھ کر ایسے مخلص اور خدا ترس اساتذۂ کرام کی جماعت چھوڑی ہے جو آپ کے اس چشمہ فیض کو ہمیشہ جاری رکھیں گے اور یوں آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے علمی فیض سے دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے طالبانِ علم فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری



مولانا مرحوم کے نام سے تو میں عہدِ شباب ہی سے واقف تھا، لیکن انہیں دیکھنے یا پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، سب سے پہلے مجھے ان کے چند پرائیوٹ [نجی] خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے ۱۹۵٦ء میں قاہرہ میں ایک بنگالی طالب علم شبیر علی عثمانی کے نام لکھے تھے، یہ طالب علم مجھ سے حسنِ ظن رکھتے تھے اور سارے خطوط مجھے دکھا دیا کرتے تھے، مولانا مرحوم کا خط صاف اور نفیس تھا اور انہوں نے ہر خط میں شبیر علی کو نصیحت کی تھی کہ وہ قاہرہ کی چکا چوند کرنے والی زندگی میں خدا سے تعلق نہ توڑ بیٹھے، مولانا نے رات کی تنہائیوں میں اللہ سے تعلق قائم کرنے پر زور دیا تھا، میں ان خطوط کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں ذاتی طور پر مذہب یا دین میں سیاست کو نہیں اللہ کی ذات کو بنیادی نقطہ تصور کرتا ہوں اور جب کبھی دین کی تعبیر و تشریح سیاسی زبان میں کی جائے گی، دین اپنی حُسن اور پاکیزگی کھو بیٹھے گا، اور بازیچۂ اطفال بن کے رہ جائے گا۔

غیر ملکی قیام سے واپسی پر میری نگاہ سے ان کی کتاب "مشکلات القرآن" گذری، کتاب ہر چند بہت ہی مختصر ہے، لیکن اس میں مولانا نے تفسیر و تشریحات کے ذیل میں مولانا آزاد کی معروف تفسیر ''ترجمان القرآن'' پر تبصرہ کیا ہے، اس تبصرہ سے مجھے ذاتی

طور پر اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت سے مجھے انکار نہیں کہ میں مولانا کے خلوص سے، جس نے ان سے یہ تبصرہ لکھوایا تھا متاثر ہوا، انہوں نے مولانا آزاد کی تعریف بھی کی، اور دیانت داری سے جس رائے کو صحیح سمجھا اسے بیان بھی کیا، یہ نقطۂ نظر علمی دنیا میں انتہائی قابلِ قدر ہے اور خاص طور پر ہندو پاکستان میں، جہاں پر اختلافِ رائے کو تعصب یا دشمنی کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔

مولانا سے اس غائبانہ تعارف یا عقیدت کے بعد ۱۹۷۰ء میں لاہور میں ملاقات بھی ہوگئی، وہ اوقاف بورڈ کے ایک اجتماع میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے، لیکن اجتماع میں تقریباً وہ خاموش بیٹھے رہے لیکن ان کی خاموشی میں بھی ایک وقار اور متانت تھی، اجتماع کے بعد ان سے میں نے اپنا تعارف کرایا اور حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کی مختصر کتاب "حدوث العالم" ان سے طلب کی۔ انہوں نے واپس کراچی جاکر حسب وعدہ نہ صرف "حدوث العالم" بھجوائی بلکہ حضرت شاہ صاحب کی سوانح عمری "نفحة العنبر" جسے خود انہوں نے لکھا تھا، بھی بھجوادی، اخلاقی ذمہ داری کا اس حد تک احساس یقیناً ان لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جن کا خدا سے خاص تعلق ہو، لیکن افسوس! میں انہیں شکریہ تک کا خط نہ لکھ سکا، آخر جب گذشتہ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں یہاں اسلام آباد میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے پرائیویٹ [نجی] خطوط بنام شبیر علی اور ان کی فرستادہ کتابوں کا تذکرہ کیا اور شکریہ ادا کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ شبیر علی حالیہ وقت میں سعودی عرب میں کسی جگہ مدرس ہیں۔

مولانا سے یہ ملاقات بہت مفصل ہوئی تھی اس لیے ان کی سیرت کے حسین پہلو بھی سامنے آئے، خدا نے انہیں ظاہری حُسن کے ساتھ ساتھ معنوی حُسن سے بھی نوازا تھا، گفتگو بڑی لطیف و شائستہ تھی، لطائف و ظرائف کی وجہ سے اس میں مزید حُسن پیدا ہوگیا تھا اور وہ جو یبوست و ثقاہت کو بزرگی کا حصہ تصور کرلیا گیا ہے مولانا کی گفتگو کو اس سے یکسر

آزاد پایا۔

مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن (سابق ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی) کے بعض افکار سے خوش نہیں تھے، انہوں نے اپنی گفتگو میں تفصیل سے اس کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ فضل الرحمٰن نے انگریزی سے بعض اچھی باتیں بھی سیکھی ہیں، مثلاً صبر وتحمل، میں نے ان سے (فضل الرحمٰن سے) سخت کلامی کی تھی لیکن وہ برابر خندہ پیشانی سے سنتے اور تبسم کرتے رہے۔''

اس داستان سرائی سے مقصد یہ ہے کہ خدا نے مولانا کو دونوں علم اور عمل سے نوازا تھا، اور تصوف سے گہرے لگاؤ کی بناء پر ان کی گفتگو لطیف اور پاکیزہ ہوتی تھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس عہدِ پُر آشوب میں جب کہ سیاست نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے برابر مسندِ تدریس پر بیٹھے رہے اور اخلاقی وروحانی اصلاح کا پیغمبرانہ مشن ان کے سامنے رہا۔

مولانا سید محمد یوسف بنوری کے اسم گرامی سے آغاز شباب سے ہی واقف تھا لیکن ۱۹۷۰ء میں پہلی بار مغربی پاکستان اوقاف بورڈ کے ایک اجتماع میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مولانا اجتماع میں شرکت کے لیے کراچی سے لاہور تشریف لائے تھے، میں ان سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے رسالہ "حدوث العالم" کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے واپس کراچی جا کر مجھے یہ رسالہ اور شاہ صاحب مرحوم پر اپنی کتاب "نفحة العنبر" بھجوادی، حدوث العالم وہی رسالہ ہے جس پر ڈاکٹر محمد اقبال نے کہا تھا کہ اس موضوع پر علامہ نے جو کچھ لکھا ہے اس پر موجودہ وقت میں مغرب کا فلسفی اس سے زیادہ نہیں لکھ سکا۔

بعد میں مولانا بنوریؒ سے میرا رابطہ قائم نہ رہا، گو میں ''بینات'' پابندی سے پڑھتا رہا، ستمبر ۱۹۷۷ء میں جب مولانا اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن منتخب ہوئے تو ان سے تفصیلی نشست کا ایک موقعہ ملا، جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ میں اپنے قیام دیوبند

میں علامہ انور شاہ کے مکان پر رہتا تھا وہ بہت خوش ہوئے، باتوں باتوں میں ''احمدیت'' پر کھل کر باتیں ہوئیں، انہیں میری یہ تجویز پسند آئی کہ لندن میں برٹش میوزیم یا انڈیا آفس میں مرزا غلام احمد صاحب کے متعلق ریکارڈ سلیقہ قرینہ سے شائع کر دیا جائے، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ مولانا مرحوم نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ وہ اس کام کے لیے مجھے دو چار ماہ کے لیے لندن بھجوائیں گے، انہوں نے مجھے مرحوم مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب "هدية المهديين "بھی بھجوائی۔

مولانا کو عربی زبان پر عبور حاصل تھا، لیکن میں ان کی عربی دانی کے بجائے ان کے اخلاص، ایثار اور اسلام سے گہرے شغف و تعلق سے متاثر ہوں، اس بارے میں وہ ان لوگوں سے بھی اختلاف رکھتے تھے جن کی وہ خود بھی عزت کرتے تھے، مثلاً مشکلات قرآن میں جو ایک چھوٹا سا رسالہ عربی زبان میں ہے مولانا مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بڑے احترام سے کیا، لیکن ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے مقدمہ- جو سورہ فاتحہ سے متعلق ہے- پر تنقید بھی کی ہے، وحدت ادیان پر مولانا آزاد نے ترجمان میں جس انداز سے لکھا ہے، اسی سے مولانا بنوری کو اختلاف تھا، جس کا تذکرہ انہوں نے مشکلات قرآن میں کیا، ایسے ہی دوسرے مسائل کا بھی، یہ اختلاف نظر اخلاص ومحبت کی بنیادوں پر تھا جس کا ذکر مصر کے ایک عالم عبدالمنعم قمر نے اپنی کتاب- ابوالکلام آزاد اور حضرت بنوری صاحب جو قاہرہ سے شائع ہوئی- میں بھی کیا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب علماء میں دونوں- ابوالکلام آزاد اور بنوری صاحب- کس قدر مقبول تھے۔

عہد حاضر میں مسلمانوں کی ذہنی وفکر مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظیم روایات اور جدید فکر میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے، جدید گروہ روایات سے نابلد ہے اور روایات کا حامل طبقہ فکر حاضر سے تغافل برت رہا

ہے، ڈاکٹر محمد اقبال اور ابوالکلام آزاد صحیح معنی میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج تھے اور علمائے دیوبند اور خاص طور پر مولانا محمود حسن صاحب اس امتزاج کے حق میں تھے، ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں مولانا شیخ الہندؒ کا ورود اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کڑی تھی، مولانا بنوری کا تعلق بھی اسی مقدس گروہ سے تھ، جو مسلمانوں کو عقل، عشق اور اخلاص کی راہوں سے خود اعتمادی، عزت نفس، طہارت قلب اور بلند نظری کا درس دے رہا ہے اور اسی چیز میں ان کی عظمت مضمر ہے۔

وہ دوبارا اکتوبر میں اسلام آباد تشریف لائے، ۱۵/اکتوبر کو نظریاتی کونسل کے ارکان بمعہ صدر صاحبان ادارہ تحقیقات اسلامی میں تشریف لائے لیکن مولانا بنوری اپنی ناگہانی بیماری کی وجہ سے تشریف نہ لائے لیکن ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مولانا کی بیماری جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے، چنانچہ جب دوسرے یا تیسرے دن ان سے ملنے کے لیے ان کی اقامت گاہ سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ مولانا ہسپتال میں ہیں اور تیسرے روز یہ افسوس ناک خبر بھی سن لی کہ مولانا اس دنیا سے ہی سفر کر چکے ہیں، چنانچہ اب کی باران کے ملنے کی سعادت حاصل نہ ہوسکی، البتہ جنازہ میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، لوگوں نے جس انداز سے ان کا ماتم کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا سے لوگ کس قدر پیار کرتے تھے۔

مولاناسید سلیمان ندوی

مکاتیبِ سلیمان ندوی

(۱)

یوسف أیها الصدیق والصدیق
تالله لقد اثرك الله علینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں خود سبقت کرنا چاہتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے سبقت کی نعمت اسی کو عنایت فرمائی جس کی قسمت میں سبقت لهم منّا الحسنیٰ کا حکم مقدر تھا۔

آپ کا ذکر تو کانوں میں پڑا تھا، مگر آپ کو دیکھنے کا موقع اسی وقت ملا، آپ سے مل کر اور آپ کو پاکر، اور پھر اپنے سے قریب پاکر بڑی خوشی ہوئی، اور خصوصاً حضرت والا رحمہ اللہ کی نسبت نے تو اخوتِ روحانی کی حیثیت پیدا کرلی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چشمۂ صفا کو تکدراتِ زمانہ سے محفوظ رکھیں۔

پھر مزید شکریہ کہ آپ نے حکیم صاحب تک پہنچایا اور ان سے ملایا، بحمد اللہ کہ مرض کی شدت اور مدت میں تخفیف ہوئی آج ہی حکیم صاحب کو بھی خط لکھا ہے۔

مسئلہ ربوا پر اقتباس ملا، زحمت کشی کا شکریہ،

حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کی کتاب خاتم النبیین کا اردو ترجمہ جس کا وعدہ تھا کیا آپ کی طرف سے ہوا ہے، کتاب شاہ صاحب کی دوسری تصنیفات کی طرح نہایت

غامض ہے اور محتاج بیان وتشریح ، آجکل میں اس پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں ، میری بھی دلی تمنا ہے کہ آپ کی صحبت جلد از جلد حاصل ہو کہ آپ کے علوم سے استفادہ کرسکوں، اللہ تعالیٰ آپ کی ذات کو اسلام اور علوم اسلام کے لیے نافع فرمائیں، ابھی آپ کا مضمون مسئلہ تراویح پر پڑھا۔

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ، کبھی معارف کی مجلس کو بھی زینت دیجئے۔

والسلام

ہیچمدان سلیمان

۲۹۔شعبان ۱۳۶۴

(۲)

جمیل السجایا کریم الشیم

بارك الله تعالی فی عمرکم وعملکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ کہ مع الخیر ہوں ،عوارض لاحقہ کا اثر گو ہر روز کچھ نہ کچھ ظاہر ہوتا ہے تاہم تخفیف ہے، دوائیں استعمال میں ہیں ،حکیم صاحب کو رمضان المبارک سے پہلے کارڈ لکھا تھا، مگر جواب نہ ملا ،شاید خط نہ پہنچا ہو ،اب دوسرا خط مفتی سید مہدی حسن صاحب کی معرفت بھیجا ہے شاید ملے۔

آپ نے علمائے زمانہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے و هم یحسبون انهم یحسنون صنعا، زین لهم الشیطان اعمالهم، ہمارے سارے کاروبار کا اصل مقصد دین کی حفاظت اور دین کی خدمت ہے

غرض اندر میاں سلامت اوست

جی ہاں مولانا کشمیریؒ کی کتاب بار بار دیکھنے سے سمجھ میں اہل فکر کے آجاتی ہے،

مگر اصل کام تو بے فکروں کو سمجھانا ہے، ضرورت ہے کہ کوئی سمجھ کر دوسروں کو بھی سمجھادے کہ فائدہ تام بھی ہو اور عام بھی، اللہ تعالیٰ میرے ارادہ کو پورا فرمائیں، ابھی اس بحث پر لوگوں کی کتابیں جمع کر رہا ہوں، ہمت ہر طرح کی کرتا ہوں مگر صحت کا ضعف، ضعف عزیمت کا باعث ہو جاتا ہے۔

تجارتی کتب فروشوں نے دین کے مصالح کا ستیاناس کر رکھا ہے۔

جوگنہ کیجئے صواب ہے آج

حضرت محدث دہلویؒ کی ذوقی تصانیف کے باب میں بھی میں آپ سے موافق ہوں، ان کی ذراسی تعبیر کے اختلاف سے کفر اور ایمان کا معاملہ ہو جاتا ہے، آج تک نیچری حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات کے ساتھ یہی معاملہ کرتے رہے اور کل تک علماء اس پر نکیر کرتے رہے، اب وہی کام علمائے کرام فرمارہے ہیں، فیا خیبۃ المسعی ویا غربتا الاسلام

اردو تحریر میں دو باتیں پیش نظر رہیں، حشو سے خالی ہو، اور اصل مقصد سے کبھی گریز نہ ہو، اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کی تحریر میں یہ باتیں ہیں میرے اس فقرہ کو اُس معنی میں سمجھیے، جیسے ولاتکن للخائنین خصیماوغیرہ

راندیر کے ہفوات زیر طبع ہیں، چھپیں تو حاضر کروں، کوشش کی ہے کہ حضرت والا کا رنگ پیدا ہو، لکن شتان بین الری والریا لیکن

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ہیچمداں سلیمان

مولوی احمد رضا صاحب نے کلیات ابی البقا کے متعلق مولوی عبدالماجد صاحب کو لکھا ہے کہ وہ عاریۃً اپنا نسخہ ان کو دے سکتے ہیں، کیا وہ نسخہ آپ کے ادارہ میں ہے اگر

اس کی قیمت خرید معلوم ہو تو مطلع کیجئے، ایک ایرانی صاحب اپنے نسخہ کی قیمت سو روپے مانگ رہے ہیں حالانکہ کتاب چند سو صفحوں کی ہے، یہ گراں فروشی بعلت کس دفعہ کے تحت میں آئے گی۔

والسلام

سنا ہے مولانا شبیر احمد صاحب کسی بڑے عہدہ پر حیدر آباد میں مقرر ہوئے ہیں، ممکن ہے وہی جگہ ہو جو ارکان حیدر آباد مجھے پیش کر رہے تھے یعنی صدارت علوم اسلامیہ۔

والسلام

(۳)

جیب لبیب زادکم اللہ تعالی فضلاً و نبلاً

السلام علیکم و رحمتہ اللہ

آپ کو تعجب ہوگا کہ ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا میں آپ کو خط نہ لکھ سکا، یہ فقیر الی اللہ ۱۹ رمضان المبارک سے حوالی قلب کے درد میں ایسا مبتلا ہوا کہ متواتر ۴۸ گھنٹے نہ بیٹھ سکا نہ لیٹ سکا، کھڑے کھڑے دونوں قدم سوج گئے، اس کے بعد چند راتیں بیٹھ کر، بستر پر اوندھے ہو کر سر کئے۔ بہر حال

ہرچہ آید بر سر اولاد آدم بگذرد

یہ دن گزر گئے ضعف جسمانی و دماغی و قلبی اتنا ہو گیا کہ کسی قسم کی حرکت کے قابل نہ رہا، بحمد اللہ کہ رفتہ رفتہ ضعف تو بہت کم ہو گیا ہے، مگر دماغی و قلبی بہت کچھ ہے، اب چند روز سے احباب کو اپنے ہاتھ سے کچھ لکھنے لگا ہوں، دو چار خط سے زیادہ لکھنا چاہوں تو دماغ جواب دے دیتا ہے، آج آپ کے جواب کی نوبت آئی، غالباً اب دماغی کام کے قابل نہیں رہا۔

کلیات ابی البقا کی فوری کوئی ضرورت نہیں ہے، دارالتکمیل کا خیال ہے، اگر

آپ مدد کریں تو کیا کہنا احباب ایک عربی دارالاشاعت کی اسکیم بھی پیش کر رہے ہیں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن دارالفتن ہے اس کی اصلاح و تنظیم بہت مشکل ہے، مجھے بھی چاہا گیا تھا کہ اس کی ایک اصلاحی تنظیم کی تجویز مرتب کروں۔

آپ کی محبت دل میں راسخ ہوتی جارہی ہے، انبتا اللہ نباتاً حسناً،

والسلام

ہیچ مداں سلیمان

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء

(۴)

میرٹھ۔ بذریعہ سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

حبیب محترم زادکم اللہ قدرًا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ فقیر چند ہفتوں سے اپنے عزیز کے پاس میرٹھ میں ہے اور بحمداللہ کہ اب خیر وعافیت سے ہم قرین ہے، یہاں کے قیام کی ایک نعمت مولانا بدر عالم صاحب کی ملاقات بھی ہے، کرم فرمایا، تشریف لائے اپنے مکان پر لے گئے اور الطاف سے نوازا، جی کردل خوش ہوا۔

ابھی تو دہلی میں مناسب مکان کا ملنا واقعی بہت مشکل ہے اور بڑے شہروں کے سیاسی بحران کا خطرہ بھی درست ہے، ہم لوگوں نے اسی لیے لکھنؤ چھوڑ کر اعظم گڑھ کو قبول کیا، گو اب ایک شاخ لکھنؤ میں بھی قائم کرنے کا خیال ہے، سیاسیات کے باب میں ابھی تک عزلت گزینی پر قائم ہوں اور اسی میں اپنی فلاح سمجھتا ہوں امت کی خدمت صرف سیاست ہی میں منحصر نہیں ہے، اللہ تعالی آپ کو اور آپ کے ساتھ اس ناکارہ کو اپنی نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔

والسلام

سید سلیمان

۱۲ ذالحجہ ۱۳۶۴ء

(۵)

میرٹھ

حبیب محترم زادکم الله مجدًا وفضلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت سے آپ کا والا نامہ آیا تھا جواب میں تاخیر ہوئی، الحمد للہ تعالی کہ میں مع الخیر ہوں، اب میں پرسوں ان شاء اللہ تعالی یہاں سے لکھنؤ روانہ ہوتا ہوں، وہاں کا پتہ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ ہے وہاں ہفتہ عشرہ قیام رہے گا۔

اس وقت آپ کا رقیمہ کریمہ ہاتھ میں ہے اور حسن یوسفی تصور میں، گویا تصور شیخ کا کام تصور حبیب ومحبوب سے لے رہا ہوں آپ کے الطاف کریمانہ نے آپ کا شیدا بنا رکھا ہے، دعا ہے کہ اللہ اپنے فضل وکرم سے آپ کو بہرۂ وافر عطا فرمائیں اور سلف صالح کا خلف صالح بنائیں۔

ادھر میرٹھ میں قیام کے سبب سے دو چار روز کے لیے دیو بند سہارن پور تھانہ بھون اور دہلی ہو آیا ہر جگہ سیاسیات کے الجھاؤ سے اصحاب عمائم اور اہل درس وتدریس کو پراگندہ خاطر پایا، اللہ تعالی امت محمدیہ پر رحم فرمائیں، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا طیب صاحب، مولانا حسین احمد صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب سب سے ملاقاتیں ہوئیں، فاما لهذا واما لهذا

دینی اعتبار سے گو قدیم مطالع نور پر آپ کو ظلمات نظر آنے سے پریشانی ہو، لیکن بحمد اللہ اب دوسرے مطالع سے استشراق نور کے آثار ظاہر ہیں اور ”لا یــزال طـائفة

من أمتی" کی بشارت اطمینان بخش ہے۔

آپ کی مجلس دہلی کو منتقل ہونے کے بعد امید ہے کہ یہاں دینی حلقہ میں مزید استواری کا باعث بنے گی بشرطیکہ آپ کے رفقاء استقامت کو کام میں لائیں وأنتم أهل لذلك، ورنہ لغزش گاہیں بھی سامنے ہی ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ اور آپ کے رفقاء کے ذریعہ مسلمانوں کو صحیح ہدایت نصیب فرمائیں۔

ہاں ایک حوالہ آپ سے پوچھنا ہے شاید آپ کی وسیع نظر مطالعہ میں آیا ہو، میں نے شاطبی کی موافقات یا آمدی کی الاحکام میں پڑھا تھا کہ نبی کی دو بعثتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ذاتی بعثت جو "هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم" کا منشا ہے اور دوسری مجموع امت کے پردہ میں جو "کنتم خیر أمة أخرجت للناس" کا منشا ہے، مجھے ادھر تلاش کرنے پر یہ موقع ملا نہیں، اگر آپ ڈھونڈ کر نکال سکیں تو مطلع فرمائیں۔

نیز "لا حاکم الا الله" پر بحث اگر قدماء و متوسطین کی کتب اصول میں آپ کی نظر سے گذری ہو تو کتاب و باب و صفحہ کے حوالہ سے مطلع فرمائیں، پہلا مسئلہ حجۃ اللہ [البالغہ] میں اور دوسرا مسلّم اور اصول مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید میں مذکور ہے۔

حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ حیات اردو میں چند صفحات میں لکھ دیں تو ممنون ہوں گا۔

والسلام

ہیچمدان سلیمان

۴ صفر ۱۳٦۵ھ

(٦)

حبیب مکرم زادکم الله علما و فضلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کچھ دن ہوئے جب میں لکھنو میں تھا آپ کا مفصل والا نامہ ملا تھا جس میں آپ نے اپنی مہربانی سے بہت سی معلومات سے مستفید فرمایا تھا۔ شکر الله سعیکم۔

میرے بمبئی کے سفر کی اطلاع غلط ہے، مجھے آپ ہی کے خط سے پہلے پہل اس کا علم ہوا، اس کے بعد بعض احباب کے خط آئے، میں نے معذرت کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ اب طبیعت کو ان مباحث سے مناسبت نہیں رہی، اگر اب اس وادی میں پھر قدم رکھوں تو پچھلے سالوں میں جو کچھ اندوختہ بھی جمع ہوا ہے، اگر وہ جمع ہوا ہے تو اس کے ضیعان کا گمان قوی ہے، فالحمد لله علی ما انا فیه، وهو الخیر وفی الخیر لی ان شاء الله تعالیٰ.

درجۂ تکمیل کے قیام کے لیے میں بے حد مضطرب ہوں، دارالعلوم ندوہ میں سامان ہے مگر مال نہیں، دارالمصنفین میں مال ہے مگر بالفعل مقتضائے احوال نہیں، الا ان یشاء الله تعالیٰ، مارچ کے آخر میں ارکان کا جلسہ ہے اس میں بحث و تمحیص ہو تو فیصلہ ہوگا، والمسئول من الله تعالیٰ ان یهدینا طریق الصواب والثواب.

پھر اہم چیز چند باکمال شیوخ کی دستیابی ہے، اگر آپ کی اعانت شامل ہوتی تو کیا بات تھی مگر آپ تو دہلی اور ڈابھیل کے مابین ہیں، کیا ان دو کے سوا کوئی تیسرا مرکز بھی آپ کا ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ دہلی اور ڈابھیل کے وسط میں کوئی مقام نکل آئے، کاش آپ سے کوئی تسلی کا کلمہ سنتا۔

حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ اردو میں چند صفحات میں چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ علمائے کرام کے نام سے اس عہد کے علماء کے تراجم کا مجموعہ ترتیب دیا جائے۔

عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت

خدا کا شکر ہے کہ پچھلے حملہ کے بعد سے اللہ تعالی نے محض اپنے فضل و کرم سے بغیر

کسی ظاہری سبب کے اس مرض سے جس کا نمونہ آپ نے راندیر میں دیکھا تھا اور جس سے میں بہت پریشان تھا اس سے اپنے عاجز ودرماندہ بندہ کو شفا بخشی والحمد للہ تعالیٰ،

والسلام

ہیچمدان و ہیچ میرز سید سلیمان

۶ صفر ۱۳۶۵ھ

(۷)

پٹنہ

محبّ مکرم زادکم اللہ تعالیٰ علما و فضلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ بڑے انتظار کے بعد ملا، میں سفر میں ہوں اور خدا جانے یہ مدت سفر کب تک جاری رہے۔

تکمیل "العرف الشذی" اور مفتی مہدی حسن صاحب اور حضرت نور المشائخ دام فیضہما کی صحبت علمی و روحانی کے احوال مبارکہ کے واقعات سن کے آپ کے حق میں دعائے خیر نکلی، اللھم زد فزد۔

حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ کے سوانح کے اوراق کا ہمیشہ انتظار رہے گا،

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجلس کو کسی شمالی علاقہ میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے دہلی کو پسند کیا مگر وہاں کے مشکلات حل نہیں ہوتے، ''ذہن'' میں ایک بات آئی اس لیے عرض ہے کہ اس پر غور کریں، والی بھوپال چاہتے ہیں کہ ان کا دارالریاست پہلے کی طرح پھر علوم عربیہ دینیہ کا مرکز بنے، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ انھیں مشاغل کے ساتھ بھوپال آسکیں، گو یہ چیز طے شدہ نہیں اور نہ اس باب میں ابھی تک حکامِ ریاست سے کوئی مراجعہ کیا گیا ہے، مگر آپ کی مرضی معلوم ہو تو آگے کچھ عرض کردوں، یا پوری مجلس کو یہاں

منتقل کیا جائے اور آپ کو جو معاوضہ وہاں ملتا ہو وہ یہاں بھی ملے، کم نہ ہو بلکہ زیادہ ہی ہو، تو کیسا ہے، جواب کا انتظار رہے گا۔

نیز آپ نے اپنے ایک پنجابی فاضل کا ذکر کیا تھا جو ادب اور حدیث دونوں میں کمال رکھتے ہیں وہ کیا ہم کو مل سکتے ہیں، علم وفضل کے ساتھ ضرورت حسنِ صحبت اور حسنِ اخلاق کی ہے جس سے مختلف اہل کمال کی یک جائی ناگواریوں سے محفوظ رہے

والسلام

ہیچمدان سلیمان

۱۱ج ۲ ۱۳۶۵ھ

(۸)

بذریعہ مشیر المہام تعلیمات۔ بھوپال

محب مکرم أدام الله فضائلكم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں نے آپ کو پشاور کے پتہ سے ایک خط لکھا تھا جس کا جواب نہیں ملا جس میں آپ سے بھوپال آنے کی خواہش کی تھی، اب ذرا تفصیل سے لکھتا ہوں۔

یہاں کے حکام مجھے دارالقضاء، دارالافتاء اور دیگر دفاتر شرعی اور تعلیم عربی و مشرقی کی نظامت ونگرانی کے لیے کہہ رہے ہیں، میں اس وقت ان کے اصرار سے صرف آ گیا ہوں اور دفاتر کے معاملات کو سمجھ رہا ہوں، بہر حال میرا رہنا آپ جیسے دوستوں کی رفاقت ہی سے ممکن ہے، مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی میں نے لکھا ہے، مدرسہ میں جس کا نام جامعہ احمدیہ ہے اور جس کا خاص نصاب ہے ایک محدث اول کی ضرورت ہے جس کی تنخواہ ڈھائی سو ماہوار ہوگی میرا جی چاہتا ہے کہ آپ اس کو قبول کر لیتے، اور آپ کا جو کام تالیف وتصنیف کا ہے وہ بھی جاری رہتا، یہ بھی ممکن ہے کہ مجلس علمی کے کام کو یہیں سے بیٹھ کر

کریں، ایک مجلس نشر و تالیف کی تجویز بھی یہاں ہے جس کے لیے پانچ سو ماہوار کی امداد سرکاری جاری ہوگی، اسی رقم سے دارالتکمیل کا خیال جو میرے آپ کے درمیان مشترک ہے ہوگا۔

غرض ایک اچھا موقع ہے، امید ہے کہ آپ میری درخواست پر غور کر کے جواب لکھیں اور جلد لکھیں، آپ نے اپنے ایک کیمبل پوری دوست کا ذکر کیا تھا کیا وہ ۵۰ تک میں آسکیں گے، آدمی ایسا ہو جو عالم ہو مگر اس کو اپنے علم پر غرور نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کر سکے۔

والسلام

سید سلیمان

۳۰ جون ۱۹۴۶ء

(۹)

بھوپال

بذریعہ سیکرٹری تعلیمات

محبِ مکرم أدام الله بركاتكم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

رجسٹرڈ والا نامہ ملا، خوشی ہوئی کہ آپ رفاقت کو آمادہ ہیں، یہاں رمضان المبارک میں صرف عشرہ اخیرہ میں تعطیل ہوتی ہے ورنہ کام ہوتا ہے، اس لیے آپ پشاور جانے سے پہلے یہاں آ کر مجھ سے مل لیں، تا کہ حکام آپ سے واقف ہو جائیں، وقت آمد لکھیں تا کہ اسٹیشن پر آپ کو لیا جائے۔ میں اس وقت تو شاہی مہمان خانہ میں ہوں مگر عنقریب شہر میں اٹھ جاؤں گا۔ میرا مکان موتی مسجد کے پاس چیف انجینئر کے مکان میں ہے اسی نام سے یہ مکان مشہور ہے۔

آپ اپنی کتابیں وغیرہ یہاں منتقل کر لیں بالفعل جب تک کوئی دوسرا سامان ہو میرے مکان میں کافی جگہ ہے۔

یہ مدرسہ احمدیہ پہلے بہت آباد تھا اس اثناء میں ایسے انتظامی تغیرات آئے یہ مٹنے کے قریب آ گیا اب حکام اس کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ مکان بھی موزوں نہیں طلبہ بھی کم ہیں، اب آپ حضرات کی مساعی سے اس کی نشأۃ ثانیہ کی امید کی جاتی ہے، مفتی شفیع صاحب کو بھی ایک جگہ کے لیے لکھا ہے آپ ہی کے ساتھ خط لکھا تھا جواب نہیں آیا اب پھر لکھ رہا ہوں، میرے مکان کا پتہ: متصل موتی مسجد بھوپال۔

والسلام

سید سلیمان

۱۴ شعبان ۱۳۶۵ھ

(۱۰)

محب مکرم حقق اللہ آمالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

والا نامہ مورخہ ۱۵ ستمبر ملا، اس سے پہلے کا مکرمت نامہ بھی ہم دست ہوا تھا، ان عنایتوں کا شکریہ، بہتر ہے کہ آپ اپنے والد ماجد صاحب کے ساتھ سفر حج کریں، ابھی تک آپ حضرات کے تقررات کی منظوری نہیں آئی، ریاستوں میں ایک دن کا کام ہفتوں میں اور ہفتہ کا کام مہینوں میں ہوتا ہے آپ جب آئیں میرے مہمان ہوں گے، لیکن سرکاری اطلاع کا انتظار کر کے آئیں تو بہتر ہے۔

اپنے والد ماجد کو میرا سلام غائبانہ پہنچا دیں۔ اچھا ہوا کہ آپ اسی سال مشرف بحج و زیارت ہوں گے۔

تا سالِ دگر می کہ خورد زندہ کہ ماند

مولانا شبیر احمد صاحب سنا ہے حیدر آباد جا رہے ہیں، افسوس کہ سلیمانیہ میں کوئی ایسی جگہ خالی نہیں جو مولوی حبیب اللہ صاحب کو تکلیف دی جائے۔

والسلام

ہیچ مدان سید سلیمان

۱۸ ستمبر ۱۹۴۶ء

(۱۱)

بھوپال

محب مکرم أدام الله مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محبت نامہ ملا، حالات معلوم ہوئے، مبارک کہ آپ نے اس سفر پاک کی منزلیں بخیر و خوبی تمام کیں، اور شکریہ کہ یاد رکھنے کے موقعوں میں آپ نے مجھے یاد رکھا، جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً، آئندہ بھی آپ کی دعاؤں کا خواستگار رہوں۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں، آپ کے پیچھے مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی مدرس فتحپوری و شارح ترمذی یہاں بحیثیت محدث ماہوار پر آ گئے، ان کے بھوپالی المولد ہونے کی وجہ سے ان کے تقرر میں آسانی ہوئی، مگر ان کی عمر کا مرحلہ ابھی کونسل میں پیش ہے۔

آپ کے معاملہ میں مشیر المہام صاحب نے کچھ دنوں توقف کرنے کو کہا تھا، آپ کے ایام حج تک توقف کیا اب آپ کا خط آیا تو فقیہ اول کی جگہ کے لیے میں نے نیم سرکاری مراسلہ مشیر المہام صاحب تعلیمات کو بھیجا ہے کہ وہ اپنے منشا سے مطلع کریں، ان کے جواب کا انتظار ہے، اس درمیان میں اگر آپ کی کہیں سے دعوت آئے تو نہ اس کو کلیۃً رد کریں اور نہ قبول، بلکہ مجھ سے پوچھ کر فیصلہ کریں تاکہ جو صورتِ حال ہو اس سے میں

آپ کو مطلع کردوں۔

والسلام

سید سلیمان

۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء

(۱۲)

بھوپال

محبّ صادق و یار لوافق رفعکم اللہ درجات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

واقعی نادم و شرمندہ ہوں کہ مجھ سے جواب میں تاخیر ہوئی اور ہوتی ہے مگر

حقہ مہر بدان نام ونشان است کہ بود

بحمد اللہ کہ آپ کی محبت میں مستقیم ہوں، آپ کے بچہ کی علالت وصحت کا حال معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ صحتِ کاملہ بخشیں، آپ کے صوبے کے حالات اخباروں سے معلوم ہوتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ وہ کرے جس میں مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔

میں ابھی تک اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوا ہوں؛ اب ہمارے یہاں نئی وزارتِ تعلیم بنی ہے، دیکھیے اس کا کیا رویہ ہوتا ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء

(۱۳)

بھوپال

حبیبی الحمیم زادکم اللہ تعالیٰ فضلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عنایت نامہ ملا، میرے پچھلے خط کے بعد یہاں کی سیاسی اور حکومتی رفتار میں ایک خاص تبدیلی ہوئی ہے یعنی یہ کہ وزیر تعلیم ایک اور صاحب ہوگئے ہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ تعلیمات میں ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز نہ کیا جائے اس سے توقع ہوئی کہ شاید آپ کے باب میں میری خواہش پوری ہو جائے ان سے میری گفتگو بھی ہوئی اور اس غرض سے کہ آپ کے بلانے کا بار وہ محسوس کریں میں نے ان سے یہ کہا بلکہ خود انھوں نے کہا کہ وہ خود آپ کو بلوائیں گے، مولوی مطیع اللہ صاحب افغانی نے جو خط آپ کو لکھا تھا وہ خود اسی سمجھوتہ کا نتیجہ تھا خود مطیع اللہ ان سے ملتے رہتے ہیں اور آپ کے قدر شناس ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد میں کب کامیابی ہوگی، احمدیہ ۵ شوال تک بند ہے، اس اثناء میں کچھ ہو جانا چاہیے، ڈابھیل کا کام یہاں رہ کر بھی آپ کر سکتے ہیں، میں پھر تحریک کروں گا۔

میرا قصد امسال اکتوبر میں سفر حج کا ہے، تین مہینے لگیں گے، نہیں کہہ سکتا کہ واپسی کے بعد میرا کہاں قیام ہو اگر ہندوستان میں امن و اطمینان نہ ہوا تو پھر یہیں رہنا ہوگا، جی چاہتا ہے کہ اپنے سامنے اس سرزمین میں کچھ علماء حق کو بساتا جاؤں، آپ افغانستان شوق سے جائیں مگر یاد کرتے رہیں اور اپنا پتہ دیتے رہیں۔

والسلام

ہیچمدان سید سلیمان

۱۲ جون ۱۹۴۷ء

(۱۴)

بھوپال

حبیبی العزیز زادکم اللہ تعالیٰ حبافیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء چند روز ہوئے کہ ملا، حالات سے آگاہ ہوا، سب سے پہلے تو آپ کی اس محبت لوجہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ایسے وقت میں بھی آپ نے مجھے فراموش نہیں فرمایا، آپ تو ایسے مقام میں ہیں جہاں سے ہندوستان کے مسلمانوں کے انتشار اور اضطراب اور بربادی اور جلا وطنی اور فرار من ہٰہنا الیٰ ھٰھنا کا منظر آنکھوں کے سامنے نہیں، اس وقت بھوپال میں پچاس ہزار پناہ گزین ہیں جن کا سارا خرچ یہ چھوٹی سی ریاست اور یہاں کے مسلمان اٹھا رہے ہیں اور اب سی پی کے مسلمان حیدر آباد جا رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مرکز قیادت کی شکست اور مسلمان لیڈروں کی کمزوری اور بے یقینی سے مسلمانوں میں مرعوبیت پیدا ہوگئی ہے اور اللہ جانے یہ بات کہاں جا کر ٹھہرے، أعوذ باللہ من الحور بعد الکور، دہلی کے مسلمانوں کی پامردی سے ممکن ہے کہ دلی میں مسلمان کچھ باقی رہ جائیں، یوپی اور بہار کی حکومت پوری کوشش کر رہی ہے کہ پنجاب کا فتنہ ان کے دروازوں میں داخل نہ ہو، بمبئی اور مدراس میں سکون ہے سی پی کی حکومت متذبذب ہے۔

بہر حال ابھی تک ہندوستان کے اندر اشیاء میں ترتیب نہیں پیدا ہوئی ہے شاید چند ماہ میں کوئی صورت ظاہر ہو،

آپ نے خواب بالکل سچ دیکھا، مع اہل وعیال سفر حج کا قصد تھا، تمام سامان بحمد اللہ فراہم تھے جہاز کے ٹکٹ آچکے تھے، کراچی سے اکتوبر کے شروع میں جہاز پر بیٹھتے مگر منظور الٰہی نہ تھا کہ یہ فتنہ کھڑا ہوا، کراچی کی راہ بند ہے اہل وعیال سہارنپور میں محصور ہیں جہاں نہ کوئی خط پہنچتا ہے نہ تار، نہ آمد ورفت کی صورت، ہر وقت ان کی حفاظت کی دعائے خیر کرتا ہوں آپ بھی کریں۔

معلوم نہیں جہاں آپ ہیں کیا صورت حال ہے؟ کیا معنوی صلاحیتیں مسلمانوں میں ابھر رہی ہیں یا صرف شور وغل اور ریا ونمائش ہے، یہ وقت جوش وخروش کا نہیں، ہوش کا ہے، مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جو غیر مسلم لوگ ان کی حکومت میں رہیں ان کی حفاظت کی ان پر کیسی شدید ذمہ داری ہے مسلمانوں کو...... ﴿ان الارض یرثھا عبادی الصالحون﴾ (انبیاء۔۱۰۵) کے مطابق صالح بننا چاہئے اور ﴿وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفھم فی الارض﴾ (نور۔۵۵) کے مطابق ایمان اور عمل صالح میں ترقی کرنی چاہئے، اس وقت مجاہدین اسلام کی بھرتی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں نظم، ثبات قدم، اطاعتِ امرا اور جدو جہد وسعی ومحنت، ایثار و اخلاص پیدا کرنے اور حب مال، حب جاہ اور حب نفس کے خبائث کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے، کاش میری یہ آرزو مسلمانوں تک پہنچ سکتی۔

آپ کا ادارہ اگر گجرات سے وہاں منتقل ہوجائے تو اچھا ہے، سنا ہوگا کہ ندوۃ المصنفین کا مکتبہ نذر آتش ہوگیا اور مکتبہ جامعہ بھی، ولعل الله یحدث بعد ذلك امرا۔

از ماست کہ بر ماست! مسلمانوں پر جو کچھ وبال ہے وہ ان کے اعمال کی سزا ہے، کاش اب بھی قلوب میں انابت ہو، اور مسلمان سمجھیں کہ ان کا مقصد اول اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے خواہ وہ تخت وسلطنت پر ہو یا بوریائے فقر پر، ان کو شیطان سے اس لیے مخاصمت نہیں کہ شیطان کا تخت زمین پر کیوں بچھا ہے بلکہ اس لیے یہ مخاصمت ہے کہ اس تخت شیطنت پر شیطان کیوں بیٹھا ہے، وہ کیوں نہیں بیٹھے ہیں۔

یہاں بحمد اللہ امن ہے اور تمام طبقات بآرام ہیں، خدا کرے کہ اس طرح یہ فتنوں کا دور گذر جائے اور بندگانِ الٰہی بعافیت رہیں۔

والسلام

سید سلیمان

۱۱/اکتوبر ۱۹۴۷ء

(۱۵)

بھوپال

محبّ مکرم وفقکم اللہ تعالیٰ لما یحب ویر ضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ نے سعادت بخشی، میں نے آغاز رمضان میں ایک سفر کیا، واپس آیا تو ذرا سفر سے تھک گیا تھا، بحمد اللہ اب اچھا ہوں اور کوئی روزہ بفضلہٖ تعالیٰ قضا نہیں ہوا، ولہ الحمد چونکہ بعض بیماریاں مجھ کو ایام رمضان میں ہوئیں، اس لیے ہر رمضان میں مجھے ڈر لگا رہتا ہے اور اس سے بچ کر صاف نکل جانے پر مسرت ہوتی ہے۔

والا نامہ سے آپ کی سیاحت اور سیاحت کے نتائج علمی وفکری معلوم ہوئے، نظامِ اسلامی کی نسبت آپ کی جو رائے ملک کو دیکھ کر ہوئی ہو مجھے قیاساً معلوم تھی۔

تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری

ہندوستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کے انجام سے اکثر قلب کو تکلیف رہتی ہے اور تخفیف اس سے ہوتی ہے کہ ہمارے امور اختیاریہ سے یہ نہیں ہے، دعا کرتا ہوں۔

از دستِ تہی بجز دعا نہ آید ہیچ

آپ نے جن صاحب کے احوال مزاجی لکھے ہیں مجھے بھی کچھ ایسا ہی احساس ہوا، اسی لیے مولوی احتشام الحق صاحب کی دعوت قبول نہ کر سکا، آپ اپنی مجلس علمی کو تو تجارتی بنیاد پر بڑی اچھی طرح چلا سکتے ہیں اور وہ چل سکتی ہے، کراچی جانا اس کا اچھا ہے، شاید کہ وہ گجرات کی گمنامی سے نکل سکے، آپ نے اچھا کیا کہ صرف ایک سال کا اپنے کو پابند کیا، ولعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا، میں بھی یہاں مطمئن نہیں، کوئی خیال بھی یہاں پورا نہیں ہوا اور نہ امید ہے، بقیہ ایام حیات کا اللہ تعالیٰ کوئی مفید دارین مصرف

نکالیں، بالفعل ذیقعدہ میں سفر حج کا قصد ہے اللہ تعالیٰ موانع دور فرمائیں۔

خواجہ عبدالحی صاحب (جامع ملیہ والے) کا سرینگر سے ایک خط آیا کہ وہ مولوی ابوالکلام صاحب کی طرف سے وہاں بھیجے گئے ہیں کہ وہاں ایک دارالعلوم قائم کریں چنانچہ اس کا افتتاح ہوگیا، ہمارے یہاں سے نصاب منگوایا تھا وہ بھیج دیا گیا، خدا کرے کہ یہ صرف سیاسی شعبدہ بازی نہ ہو، حقیقت بھی ہو، المختار الفقہ منگوائی دیکھی پسند آئی

والسلام

فقیر ہیچمدان سید سلیمان

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ

(۱۶)

بھوپال

صدیقی الحمیم متعکم اللہ تعالیٰ بالصحة والعافیة

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

صحیفہ مورخہ ۲۹ محرم ۱۳۶۹ھ کا جواب دیر سے دے رہا ہوں جس کی معافی چاہتا ہوں، میں امسال بھی محروم حج وزیارت رہا، عین وقت پر میرا نواسہ جو وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ جانے والا تھا، ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوگیا، اب زندگی ہے تو آئندہ کی امید ہے۔

میرے جن رسائل کی خیریت آپ نے دریافت کی ہے وہ سب بستر امہال و تعطل پر بیمار پڑے ہیں، جب سے میں یہاں ہوں میری علمی محبت وقلمی کاوش ختم ہوگئی ہے۔

آپ نے گجرات کے علمی جمود کا جو حال لکھا ہے وہی حرف بحرف دوسرے مدارس کا حال ہے، بہرحال اس سے مایوس نہ ہونا چاہئے اور اپنے دھن میں لگا رہنا چاہئے، دارالعلوم ندوہ میں کچھ افراد اخلاص کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کی کامیابی کی دعا فرمایئے۔

کیا آپ ڈابھیل سے زیادہ لاہور میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ اردگرد پنجاب و سرحد کے طلبہ جمع ہوسکیں، اگر کوئی امکان ہوتو کیوں نہ آزمائش کی جائے، سیاسیات سے یکسو ہوکر علم اور دین کی خاطر ہم اپنی کوششوں کو یک جا کریں، بھوپال کا تجربہ تو کامیاب نہیں ہوا۔ بہرحال اس سے اتنا سبق ملا کہ حکومت کے نظم ونسق کے ساتھ جس میں ملکی، غیر ملکی بیہودہ قانون وقاعدہ کی پیروی اور نالایق وزیروں کی مداخلت ہو علمی درس گاہیں کامیاب نہیں ہوسکتیں، مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب آٹھ نومہینوں سے ملکی غیرملکی مباحث کے سلسلے میں ایک نالائق وزیر کے ہاتھوں سے معطل ہیں، اور ہنوز ان کا معاملہ زیرِ فیصلہ ہے، ان کے لیے ایک دفعہ ڈابھیل سے تحریک ہوئی تھی مگر انھوں نے انکار کردیا تھا لیکن مجھے امید ہے کہ اگر میں انھیں مشورہ دوں تو وہ مان لیں گے، معلوم نہیں اب بھی وہاں جگہ ہے یا نہیں، تاکہ کم وبیش پر راضی ہو سکتے ہیں۔

یہاں جب سے آیا ہوں میرا بستر بندھا ہی رہا کہ خدا جانے کب اٹھانا پڑے، سو اب بھی بندھا ہے اور روز بروز دگر افتاد کا معاملہ ہے، لاہور یونیورسٹی کے صدر شعبہ اسلامیات کی حیثیت سے مجھے بلا وے کا خط آیا تھا مگر میں آمادہ نہ ہوا۔

یہاں بحمد اللہ مولوی عمران خاں ندوی کی کوشش سے مولوی الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر پوری ریاست میں دعوت تبلیغ کا بڑا اچھا کام ہورہا ہے، آجکل اس سلسلہ میں اچھا خاصہ اجتماع ہے، کیوں نہ گجرات میں اس اصول پر کام کیا جائے اور ڈابھیل اس کا مرکز ہو۔

بحمد اللہ خیریت ہے، آپ کے لیے داعی خیریت ہوں۔ بے شبہ عزیزی مولوی ابوظفر صاحب کو مجھ سے بڑی مشابہت ہے۔

والسلام

فقیر ہیچمدان سید سلیمان

۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء

(۱۷)

بھوپال

صاحب الفضائل العلیه والخصال الزکیه والخلال

المرضیه ادام الله آثارکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ مورخہ ۱۰ رمضان المبارک کا جواب آخری رمضان میں دے رہا ہوں، جی ہاں اپریل میں لکھنؤ کے بجائے مجھے دہلی اور علی گڑھ کا سفر کرنا پڑا۔

آپ نے لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کو دیکھا اور اس کی مالی حالت اور قلت سرمایہ پر جو افسوس ظاہر کیا ہے اس کا کوئی علاج بندہ کے ہاتھ میں نہیں، وہ پچاس برس سے اسی ابتلاء وامتحان میں چل رہا ہے اور ان شاء اللہ جب تک ان کی مرضی ہوگی چلتا رہے گا، اصل شے اس کی مالی حالت نہیں بلکہ وہ اصول قابلِ لحاظ ہیں جن پر اس کی بنیاد ڈالی گئی۔

آپ نے عربی مدارس کی زبوں حالی پر افسوس کیا ہے بالکل بجا ہے، طالب علموں کے ذہنوں میں ایسا انقلاب آ گیا ہے کہ وہ نفع عاجل کے علوم میں نفع آجل کے لیے ان کے دلوں میں کوئی حرارت باقی نہیں رہی ہے خود اپنی اولاد کا یہی حال پاتا ہوں اور باوجود کوشش کے ان کی ذہنیت کو نہیں بدل پاتا تو پھر دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ پاکستان میں کسی عربی درس گاہ کے قیام سے کیوں مایوس ہیں، آخر ملتان یا لاہور کے مدرسہ سے کیوں امید نہ کی جائے، اچھا اگر ان سے الگ ہو کر کوئی الگ درس گاہ کسی مناسب مقام پر قائم کی جائے تو کیا آپ تعاون کریں گے اور دوستی بنا میں حصہ لیں گے، ندوہ میں میں یہ سمجھا تھا کہ مالی استواری نہ ہونے سے طلبہ اور اساتذہ میں دوں ہمتی ہے اور اسی لیے بھوپال آیا، لیکن یہاں یہ تجربہ ہوا کہ ہر قسم کے

سرمایہ کے باوجود کوئی کامیابی اور حالت میں طلبہ اور مدرسین کے کوئی تغیر محسوس نہیں ہوا، بلکہ ذہنیت بدتر ہی پائی۔ کیونکہ اخلاص اور دین کی طلب کے بجائے روزی اور دنیا کی طلب ان کی غرض و غایت ہے، اور وہ اس عربی تعلیم سے پوری نہیں ہوتی، کامل الفن مدرسین کا فقدان ہے، چند بڈھے رہ گئے ہیں پھر خاتمہ ہے، یہی حال ہمارے مدرسہ احمدیہ کا ہے، مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب کی مدت نومبر میں ختم ہو رہی ہے دیکھیے ان کو توسیع ملتی ہے یا نہیں۔

اس صورت حال کا علاج کیا پاکستان میں ہوسکتا ہے؟ اور اگر کوئی اس اہم کام میں آپ سے مدد چاہے تو کیا آپ تیار ہیں، یہ سوال محض فرضی ہے ابھی واقعیت کی صورت نہیں۔

ہر سال کی طرح امسال بھی حج کا ارادہ ہے، اگست میں روانگی ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ، دعا کیجئے کہ امسال محرومی نہ ہو، ۵ ماہ کی رخصت لی ہے، پھر شاید ریاست سے ہمیشہ کے لیے رخصت نہ ہوجائے، امسال کے بجٹ میں تو ریاست کے مذہبی ادارے داخل ہیں۔ آئندہ سال کا حال معلوم نہیں، ریاست مٹ کر اب ریاست بھوپال صوبہ بھوپال ہوگیا ہے، نواب صاحب کی ولایت ختم ہوکر انڈین یونین کے چیف کمشنر کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔

مفتی مہدی حسن صاحب کی تشریف بری سے گجرات کو بڑی محرومی ہو جائے گی، اس کا بدل کیا ہوگا۔

والسلام

سید سلیمان

رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

۲۵ جولائی ۱۹۴۹ء

(۱۸)

صدیقی الاعزالاغر رزقکم اللہ تعالیٰ رزقاً حسناً فی الدنیا والآخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ سعادت افزا ہوا، یہ میری محرومی ہے کہ بمبئی میں آپ کے ہوتے ہوئے بھی زیارت سے فائز نہ ہوسکا۔

مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی وفات سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی ناممکن سی ہے اس کے باوجود کہ ہم دونوں دو مدرسوں میں تھے مگر طالب علمی کا عہد اور باہمی شناسائی اسی وقت سے تھی اور باہم علمی تسابق بھی تھا وہ القاسم میں لکھتے تھے اور میں الندوہ میں، جی چاہتا ہے کہ اس تذکرہ سے اس کے حق رفاقت کو ادا کردں۔

جب آپ یہاں کی علمی وتعلیمی کیت وکیفیت سے مطمئن نہیں تو کیوں نہ مملکت جدیدہ میں قسمت آزمائی فرمائیں، میرا حال تو یہ ہے کہ احوال نے دست وپابستہ رکھا ہے الا ان یشاء اللہ۔

جی ہاں ارضِ حرمین کو ہندوستان سے زیادہ علوم دین سے محروم پایا۔ چند پرانے خادمانِ دین موجود ہیں جو اب چراغِ سحر ہیں، آئندہ کی نسل تفریح کی طلب ومحبت میں ہر چیز کو قربان کررہی ہے فالی اللہ المشتکی

الحمد للہ تعالیٰ کہ اب میں اچھا ہوں، ضعف کی شکایت بہت ہوگئی تھی اب بھی کسی قدر ہے۔

اب یہاں سے بھی چل چلاؤ ہے مگر ہمت سفر ہنوز مجہول ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۳۱ جنوری ۱۹۵۰ء

مولانا سمیع الحق

سفرِ حج کی چند یادیں

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عالم عرب کے اعیان علم وفضل میں آپ کی شہرت بڑھتی ہی گئی، اور آپ بحیثیت ایک عظیم محدث اور نقاد محقق کے تسلیم کیے جانے لگے، اس کا کچھ مظاہرہ میرے سامنے اس وقت ہوا جب ۱۹۶۴ء میں اپنے سفر حج کے دوران بعض اجلّہ علم وفضل سے میری ملاقات ہوئی، عالم عرب کے عظیم داعی اور محققِ عالم علامہ شیخ مصطفیٰ السباعیؒ اس سال حرمین شریفین تشریف لائے تھے، شیخ مصطفیٰ السباعی شام کے باشندے تھے ان کا وقیع علمی مجلّہ ''حضارۃ الاسلام'' دنیائے اسلام میں معروف ہے، کئی جلیل القدر کتابوں کے مصنف ہیں۔

منکرین حدیث اور بعض متجددین نے سنتِ رسول کی حجیت کے خلاف جو ہنگامہ کھڑا کیا، اس کے اصلی محرک یورپ کے بعض یہودی مستشرق تھے، ہمارے ہاں بھی غلام احمد پرویز، ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے لوگ ان معاندینِ اسلام پروفیسروں اور اسکالروں کے حقِ تلمذ ادا کرنے میں پیش پیش رہے، ادھر عالم عرب میں بھی مصر اور بیروت جیسے خطوں میں انہیں ''وفا شعار'' مستغربین ملے۔

ایسے ہی کچھ لوگوں نے حجیت، تدوینِ حدیث، اور حدیث کے بعض اولین رواۃ اور مدوّنین کو نشانہ تحقیق بنایا۔

شیخ مصطفیٰ السباعی نے ان لوگوں کے رد میں قلم اٹھایا اور السنّة و مکانتها فی التشریع الاسلامی جیسی جامع اور محققانہ کتاب لکھی، یہ کتاب اپنی جامعیت، روانی، سلاستِ بیان اور منکرینِ حدیث کے تعاقب اور پوسٹ مارٹم کرنے میں ایک مثالی کتاب ہے۔ اور ہمارے ہاں کے اہلِ علم کے مطالعہ کی چیز ہے۔

ہمارے شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی جب پاکستان میں اس فتنہ کی ہلاکت آفرینیوں سے بے چین ہوئے تو انہوں نے ایک وقت پورے شدومد سے منکرین حدیث اور متجددین کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اس ضمن میں آپ کی نظرِ رسا شیخ مصطفیٰ السباعی کی مذکورہ کتاب پر پڑی اور مولانا محمد ادریس میرٹھی کے ترجمہ وتشریح کے ساتھ اس کتاب کو اپنے ادارہ سے ''سنت کا تشریعی مقام'' کے نام سے اردو میں شائع کیا، خیر یہ تو اس ملاقات کے بعد کی بات ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

شیخ مصطفیٰ السباعی مرحوم پر آخری سالوں میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، اسی دوران وہ حرمین شریفین تشریف لائے۔

ایام حج سے قبل وہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے قریب ایک بوسیدہ اور خستہ سے مکان میں صاحب فراش تھے۔ میں تلاش کرتے پہنچا، بسترِ علالت پر دراز، چہرہ بالکل زرد ضعیف اور ناتواں مگر صبر وشکر کا عجیب حال، فرمایا:

''کہ میں اس طویل بیماری کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اس لیے بھی سمجھ رہا ہوں کہ صحت کی حالت میں اِدھر اُدھر کے مشاغل میں وقت ضائع ہوتا ہے، جب مجھے تبدیلی آب و ہوا اور سیر و سیاحت کے لیے کہا گیا اور کچھ وقت ملا تو میں نے اسے جوارِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں گذارنے کو پسند کیا۔''

وہ مسجدِ نبوی میں حاضری سے بھی معذور تھے، مگر قربِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے عجب تسکین اور سرور کا باعث بن رہا تھا، کہ وہ اپنی صحت میں تیزی سے

تبدیلی محسوس کرنے لگے۔

گوناگوں آلام واسقام نے انہیں نڈھال کر دیا تھا، مگر عشقِ رسول، قربِ رسول اور دفاعِ حق اور جذباتِ جہاد نے آلام واستعام کو نعمتوں سے بدل دیا تھا۔

قیامِ مدینہ کے دوران انہوں نے ایک دن روضة من ریاض الجنة میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک طویل قصیدہ "مناجاة بين يدى الحبيب الاعظم" کے عنوان سے قلم بند کیا اور خود اسے مواجہہ رسولِ اعظم میں پیش فرمایا، جن میں ان کیفیات کا اظہار موجود ہے، جس کے چند ایک اشعار یہ ہیں:

یا سیدی یا حبیب الله جئت الی	اعتاب بابك اشكوا البرح من سقمىٰ
يا سيدى قد تمادى السقم فى جسدى	من شقرة السقم لم اغفل ولم اتم
الا هل حولى غرقىٰ فى رقادهم	انا الوحيد جفاه النوم من الم
قد عشت دهراً مديداً اكلهٗ عمل	واليوم لاشئ غير القول و القلم
يا سيدى طال شوقى للجهاد فهل	تو عو الى الله عوداً عالىَ العلم
تا الله ما الهفتى البرء عن رغب	فى ذى الحياة و لاحياة و لانعم
وانما طمع فى ان تقول (اى الله) غداً	لقد هديتم الى الاسلام كل عم
هيهات ان تنطوى للدين رايته	اويهزم الكفر دينا غير منهزم
فاكرم الناس من كانت منيته	فى حوته الحق جلداً غير منهزم
وان هو الناس من جأت منيته	خلواً من الهم او خِلو من الهم
اشكوا الى الله شكوىٰ غير ذى جزع	فى شدة الضرّ وجهى وجه مبتسم
ما فى قضا ئك ظلمٌ للعباد والضر	فيه الاساءة بل محض من الحكم

اسی قصیدہ کے بارہ میں خود شیخ مصطفیٰ السباعی فرماتے ہیں:

"وهى قصيدة طويلة الجهت فيها بالدعاء الى الله

والتجانت الى حرم رحمة الواسعته و ذكرت فيها رسول الله ﷺ و معجزاته فى شفاء المرضىٰ فى حياته عليه السلام الى ان قال ...... وكنت فى كل ليلة يورقنى فيها شدة الالم ازيد فى تلك القصيدة حتى لم منها حينئذٍ مأة يقرب مأه بيت".

مدینہ منورہ میں شیخ سباعی کے ساتھ یہ میری مختصر ملاقات تھی، یہ ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۳ ہجری جمعۃ المبارک کی شام کا واقعہ ہے، سباعی صاحب نے مجھے ایک طالب علم سمجھ کر اپنی عالمانہ شفقت ومحبت سے نوازا، وہ خود بستر سے، جو زمین پر بچھا ہوا تھا، اٹھ نہیں سکتے تھے، مگر مجھے حکماً کہا کہ سامنے الماری میں سے شامی حلاوہ کا ڈبہ اٹھا کر لاؤں اور ان کے سامنے اس میں سے کچھ کھالوں، تا کہ کچھ تو ضیافت ہو جائے، اس کے بعد ان کی ضیافت وشفقت ان کے نہایت وقیع، مجلّہ، حضارۃ الاسلام کی شکل میں جاری رہی، جو کچھ عرصہ قبل تک مجھے شام سے برابر موصول ہو کر حلاوہ معنوی وفکری کو موجب بنتا رہا۔

ایام حج قریب ہوئے تو شیخ سباعی مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، مناسک حج سے فراغت کے بعد طالب العلمانہ تشنگی کی بناء پر پھر مجھے عالم عرب سے آئے ہوئے اعیان علم وفضل کے زیارت اور صحبت کی خواہش ہوئی، شیخ مصطفیٰ السباعی اس وقت حرم مکہ کے قریب ''فندقِ شبرا'' میں مقیم تھے اور یہ ہوٹل عرب علماء اور شیوخ کی آرام گاہ بنا ہوا تھا، ۲۲ اپریل ۶۴ء مطابق ۱۴ ذی الحجہ میں فندقِ شبرا گیا، یہاں شیخ سباعی کے علاوہ شیخ عبد الفتاح ابوغدۃ، السید محمد علی الکتانی، احصاء کے قاضی القضاۃ قاضی منصور وغیرہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

شیخ مصطفیٰ السباعی کے ساتھ بات چیت میں پاکستان سے آئے ہوئے علماء کا ذکر بھی آیا۔ شیخ نے فرمایا، مجھے مولانا محمد یوسف سے ملنے کا اشتیاق ہے۔

اس سال چونکہ اس نام کے بعض اور اکابر بھی وارد حرمین ہوئے تھے، ایک مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر، دوسرے جماعتِ تبلیغی کے شیخ محمد یوسف دہلوی، تیسرے علامہ محمد یوسف بنوری، اس لیے استاد سباعی مرحوم نے ایک ایک کا نام گنوا کر مجھ سے الگ الگ ہر ایک کا تشخص کرایا اور فرمایا کہ مجھے شیخ محمد یوسف بنوری سے ملنے کی آرزو ہے اور میں مرنے سے قبل ان سے احادیث میں اجازت لینا چاہتا ہوں...... کاش کوئی صورت اس کی بن سکے۔

میں نے شیخ سباعی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ مری ذمہ داری ہے، میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں لے کر آؤں گا۔

فرمایا، ہرگز نہیں، یہ تو بے ادبی ہے، اور شانِ طالب علمی کے خلاف ہے، کسی طرح مکان اور وقت کا یقین ہو جائے تو مجھے خود ان کے پاس لے چلیں۔

میں نے کہا اس کے بعد میں نے کسی وقت حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے سباعی صاحب کی ملاقات اور ان کے اس اشتیاق کا ذکر کیا،

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وہ ایک جلیل القدر عالم اور اسلام کے خادم ہیں، میں انہیں کیا اجازتِ حدیث دوں گا، البتہ ملاقات اور زیارت کے لیے ضرور چلیں گے۔

اس کے بعد کسی دن حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ میرے ساتھ فندقِ شبرا تشریف لے گئے شیخ مصطفیٰ سباعی کو معلوم ہوا تو عجیب کیفیت ان پر طاری ہوئی، دیر تک محفل رہی، دونوں اپنی جگہ تواضع اور مسکنت میں ڈوبے ہوئے تھے، اس مجلس میں شیخ سباعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دیرینہ مراد بر آئی اور انہوں نے باصرار حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے صحاحِ ستہ اور احادیث کی دیگر کتابوں میں اجازت حاصل کی۔

اس سفرِ حج میں ابتداء سے آخر تک اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت بنوری رحمۃ اللہ

علیہ کی شفقتوں اور عنایتوں سے نوازا، کراچی میں ویزا کرنسی وغیرہ تمام مسائل میں حضرت نے وہ وہ توجہات فرمائیں کہ اب سوچتا ہوں کہ اگر حضرت کی عنائتیں نہ ہوتیں تو شاید ہم اس سعادت سے بہرہ ور نہ ہوتے، ہم لوگ رمضان میں براستہ الخبر اور الریاض مدینہ منورہ پہنچے، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ قاہرہ کے مجمع البحوث الاسلامیہ کی پہلی دعوت پر مصر تشریف لے گئے اور یکم اپریل ۱۹۶۴ء کو واپسی میں مدینہ طیبہ تشریف لائے، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدّ ظلہٗ مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا تاج الاسلام (مشرقی پاکستان) ان کے ہمراہ تھے، یہ وفد مسجد نبوی کے قریب پاکستان ہاؤس میں مقیم ہوا جو اس وقت غلام محمد ہاؤس کہلاتا تھا، ہم لوگ خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی صاحب نے سفر قاہرہ کے حالات سنائے۔ معارف السنن کی جلد اول کا نسخہ ہماری روانگی کے بعد چھپ گیا تھا اور پہلی بار یہاں مولانا بنوری کے ہاں دیکھا۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ میں اپنی پہلی حاضری اور بے سرو سامانی کے باوجود وہاں کے شیخ حمیدی سے ملاقات اور ان کے بھرپور الطاف وعنایات کا ذکر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے کس کس طرح غیب سے مدد فرمائی، اور شیخ حمیدی کے ساتھ نہایت آرام وراحت اور آراستہ وپیراستہ سواری میں بیٹھ کر پہلی حاضری مدینہ کے دوران تیرہ چودہ دن تک میں نے مدینہ طیبہ کے آثار مبارکہ کی تفصیلی سیاحت کی، اپنے طویل اسفار کے دوران قدرت کی ایسی ہی غیبی دستگیریوں کو بیان کر کر کے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، وکذالك مکنا لیوسف فی الارض

اس سفر میں حضرت کی معیت آخر تک نصیب رہی، یہاں تک کہ میدانِ عرفات میں وقوف کی سعادت بھی ان کے ساتھ حاصل ہوئی، ان سب حضرات کے معلم سید مکی مرزوقی تھے جو ہمارے بھی معلم تھے، میدانِ عرفات میں ان حضرات اکابر کے علاوہ امیر التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلوی اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی بھی اسی

معلم کے مخصوص خیموں میں فروکش تھے اور میدانِ سعادت میں ایسا قران السعداء سونے پر سہاگہ کا کام دے رہا تھا، اب وہ دن اور وہ منظر خواب سا لگتا ہے

خزاں رسید و گلستان بآں جمال نماند
سماع بلبل شوریدہ رخت و حال نماند
نشانہ لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی
برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

اپنی حرمان نصیبی اور تہی دستی جتنی زیادہ تھی اتنا ہی قدرت نے فیاضی سے ایسے مواقع غنیمت سے نوازا، اپنے دوسرے سفر حج کے دوران تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت ابتداء ہی سے نصیب ہوگئی۔

غالباً ۲۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو ہم نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی قیام گاہ کراچی سے احرام باندھا، طلبہ احرام اور دعاؤں میں شریک ہوئے دس گیارہ بجے دن کو جہاز نے پرواز کی ابھی جہاز نے پرواز کی ہی تھی، کراچی شہر پر چکر لگا رہا تھا کہ اناؤنسر نے محتاط رہنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم لوگ چند منٹ میں فنی خرابی کی وجہ سے دوبارہ کراچی ایئرپورٹ پر اتریں گے۔''

ایسا بہت کم ہوتا ہے اس لیے تمام عازمین حج میں، جو سب احرام میں تھے، نہایت پریشانی اور سراسیمگی دوڑ گئی، یہ پریشانی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی کہ جہاز کراچی کے سمندر پر چکر کاٹتا رہا، یہ چند منٹ تقریباً آدھ گھنٹہ میں بدل گئے بعض لوگوں نے کہا کہ اتنے بھاری جہاز میں جدہ تک چلنے کے لیے جتنا ایندھن ڈالا گیا ہے، اتنے وزن کے ساتھ جہاز کا اتارنا مشکل ہے اور اب جہاز اپنا وزن کم کرانے کی کوشش کر رہا ہے، واللہ اعلم الغیب بہر حال حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ پر مکمل اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا، مجھے تسلی دیتے رہے اور کہا کہ گھبرائیں نہیں، سورۃ قریش کا ورد کرتے رہیں سکونِ خاطر ہوگا۔

جہاز بخیریت واپس اترا، بعد میں کسی نے بتلایا کہ جہاز کے ایک انجن میں خطرناک قسم کی خرابی پیدا ہوگئی تھی، ہم لوگ اب پی، آئی، اے کے مہمان تھے۔ جس کی انتظامیہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سمیت ہم تمام حجاج کو جو تقریباً ایک سو بہتر (۱۷۲) کے لگ بھگ تھے، ایئر پورٹ کے قریب جدید طرز کے ہوٹل ''مڈوے ہاؤس'' لے گئی، دوپہر کے کھانے کے انتظام میں وقت لگ رہا تھا، ''مڈوے ہاؤس'' کا وہ خوبصورت ہال جو ہمیشہ رقص وسرور کی ظلمتوں میں ڈوبا رہتا تھا، اب اس ہال میں ڈائس پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہوئے اور لاؤڈ اسپیکر میں مناسکِ حج اور اس راہ کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں پر خطاب شروع کیا اور ہال اب "لبيك اللهم لبيك" کی پُرکیف صداؤں سے گونجنے لگا۔

شام کو دوسرے جہاز سے ہم لوگ روانہ کر دیے گئے، رات کو کسی وقت جدہ پہنچنے کے بعد حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ موٹر ٹیکسی لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہوئے اور غالباً دو یا تین بجے رات ہم حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ طواف وسعی سے فارغ ہوئے، اس سفر کا ایک عجیب وغریب واقعہ مجھے نہیں بھولتا جو حضرت بنوری قدس سرہٗ کا حضرتِ حق جل مجدہ سے خاص تعلق کا مظہر ہے اور ناز کا ایک ایسا انداز جس کا مظاہرہ عشق و محبت کے تمام مراحل طے کر کے مقامِ محبوبیت پر فائز ہونے والے خوش قسمت بندے ہی کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کے لیے حرمین شریفین کا راستہ غیب سے کھول دیا تھا، عموماً آپ ہر سال حج اور رمضان میں عمرہ اور مسجدِ نبوی کے اعتکاف کی سعادت حاصل کرتے، آخر وقت تک کوئی پروگرام متعین نہ ہوتا اور میعادِ وصال قریب ہوتے ہی آپ کا آتشیں جذبۂ شوق وصل ایسا بھڑک اٹھتا کہ حالات اجازت نہ بھی دیتے مگر آپ سب کام چھوڑ چھاڑ کر آستانۂ یار پر جبینِ نیاز خم کرنے پہنچ جاتے۔

آخری سالوں میں آپ کی ضعف ونقاہت بڑھ گئی تھی اور گھٹنوں میں شدید درد کی وجہ سے چلنا پھرنا اور کسی اونچے مکان یا زینے پر چڑھنا تو بہت مشکل ہوتا، اُدھر موسمِ حج میں ہر سال حجاج کے اژدہام میں بے حد اضافہ ہوتا رہا، اسی سفر میں ایک بار نمازِ عصر سے قبل میں نے حرم کے قریب مولانا کے مستقر پر حاضری دی، آپ خو قیر کے مکان پر ٹھہرے تھے، وہاں سے نمازِ عصر کے لیے چل پڑے، مولانا بڑی مشکل سے اژدہام میں راستہ نکالتے ہوئے چلتے رہے۔

حرم شریف پہنچے تو جماعت تیار تھی اور ہمیں حرم سے باہر سڑکوں پر صفوں میں جگہ ملی، نماز کے بعد گھٹنوں کے درد سے نڈھال ہانپتے کانپتے حرم شریف میں داخل ہوئے، گھٹنوں اور جوڑوں کے درد، حجاج کی دھکم پیل، اونچے نیچے ڈھلوانوں پر چڑھنا اترنا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اب موسمِ حج کی یہ تکالیف ناقابلِ برداشت تھیں، یہ حالات تھے کہ ہم اندر حرم شریف میں داخل ہوئے، مولانا موصوف پر عجیب حالتِ جذب طاری ہوگئی اور شانِ دلربائی سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ بھی آمین کہیں، فرمایا:

''یااللہ میں اب بالکل عاجز اور بے بس ہوگیا ہوں، میری یہ حالت آپ دیکھ رہے ہیں، میں بارہا عزم کرتا ہوں کہ اب بس ہے، آئندہ یہاں نہیں آؤں گا، اب آپ میری حالت پر رحم کیجئے اور آئندہ مجھے ہرگز یہاں مت لایئے'' ......۔

اس وقت آنسو رواں تھے، مجھے کہا ''تم نے دعا میں ساتھ دیا یا نہیں'' میں نے کہا: ''یقین کیجئے کہ آپ کی یہ دعا قبول نہیں ہوگی اور آپ کو یہاں کھینچ کر لایا جائے گا''

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں خود اٹھائے جاتے ہیں

کعبۃ اللہ کو خدا نے مثابة للناس بتایا ہے، بار بار اپنی طرف کھینچنے والا گھر، لوہا

جتنا بھی خالص ہوگا اور انجذابیت کی قوت سے مالا مال تو مقناطیس اتنا ہی اسے اپنے طرف کھینچے گا، مولانا مرحوم کی فطرت اس انجذابی کیفیت سے سرشار تھی اور وہ دعاؤں کے باوجود اس کے بعد بھی یہاں تک کہ آخری سال بھی حرمین شریفین کی طرف کھنچتے چلے جاتے رہے۔

زندگی کے آخری رمضان کا آخری عشرہ بھی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف میں گذارا، اور خدا نے ظاہری سہولتوں اور راحتوں سے بھی اپنے اس مہمان کو سفر حج وزیارت میں خوب خوب نوازا، ایک حد تک سفر بھی ان کے لیے حضر بن گیا تھا۔

عالمی دوروں اور اجتماعات کے لیے اسفار میں حتی الوسع گھر جیسا رکھ رکھاؤ اور اعلیٰ سہولتوں کے ساتھ رہتے، مولانا نے خود ایک مرتبہ پہلے سفرِ حج میں غیبی دستگیریوں کے حالات سنائے اور فرمایا کہ شعبان میں شادی ہوئی اور شوال میں حج پر جانا ہوا، پھر وہاں سے مصر وترکی وغیرہ جانا ہوا، مصر میں سال ٹھہرنا پڑا، فیض الباری کی طباعت کا کام ہورہا تھا، مگر اخراجات کی کوئی دقت نہ ہوئی، افریقہ سے ہمارے نام خطوط آئے تھے اور مصر پہنچنے سے قبل خرچ پہنچ گیا۔

مولانا ہر موقع پر کوئی علمی لطیفہ پیدا فرما لیتے، سفرِ حج میں ایک دعوت کے دوران سموسے سامنے آئے تو ایک مصری قاری جو مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ میں پڑھاتے تھے، کا اصرار تھا کہ یہ لفظ اصل میں ''سمبوسہ'' ہے، مگر مولانا کی رائے تھی کہ تمہارا لفظ محرّف ہے، سموسہ ٹھیک ہے کہ اس کی شکل مثلث ہے، تین منہ والی چیز کی بناء پر......سہ مو سہ سے سموسہ بنا ہے۔

سفرِ حج کے دوران کراچی میں مولانا کی عنایات کے ساتھ ساتھ علمی افادات اور لطائف سے بھی مستفید ہوتے رہے اور مناسکِ حج وعمرہ کے عمیق اور گہرے مسائل سے بھی مستفید فرماتے رہے، ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء کو کراچی سے ہمارے بحری جہاز کی حجازِ مقدس

روانگی تھی۔ مولانا کی خدمت میں اجازت لینے حاضر ہوئے تو حج کے بارے میں قیمتی نصائح سے نوازا اور فرمایا:

''فقہ میں صرف طواف کے دوران کے لیے تیاسر لکھا ہے، مگر حقیقت کی تشریح نہ ہوئی، اگر بحالت طواف، سینہ خانہ کعبہ کے محاذات میں ایک انچ بھی چلنے پھرنے میں آجائے تو طواف فاسد ہوجاتا ہے اور یہ ایسا ہے جیسا بحالتِ صلوٰۃ قبلہ سے انحراف ہوجائے، تو بحالتِ تقبیل واستلام حجرِ اسود بالکل کھڑا ہوجائے اور اسی حالت میں بغیر چلنے کے قدم موڑ کر استلام وتقبیل کے لیے روانہ ہو، ورنہ روانگی کی حالت میں محاذات صدر رہ جائے گا، بلکہ صدر چاروں طواف میں بالکل سیدھی رکھے، اسی طرح موسم حج سے قبل مدینہ منورہ آنا چاہیے، بعد از رمضان جس پر مکہ مکرمہ میں شوال آگیا اس کے لیے اشہر حج میں عمرہ کی ادائیگی جائز نہیں، اس لیے آپ اگر قبل از شوال مکہ مکرمہ گئے تو شوال سے قبل مدینہ منورہ واپس ہوجائیں، تاکہ ایامِ حج میں عمرہ کرسکیں اور مسلک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی مخالفت نہ ہو'' ......

مزید فرمایا:

''تعجب ہے کہ اکثر علماء احناف بھی بے احتیاطی کرتے ہیں اور آفاقیوں کی ایسی نعمت سے فائدہ اٹھانے کے نام سے توسعات نکالتے ہیں۔''

مولانا کی ان تنبیہات سے اندازہ ہوا کہ بار بار حج وزیارت کے مزاولت اور ممارست نے آپ کی طبیعت میں توسع اور تسامح نہیں پیدا کیا، بلکہ باریک سے باریک آداب وشرائط کو ملحوظ خاطر رکھنے کے جذبہ کو اور بھی گہرا کردیا ہے اور یہی وہ رعایات بیت اللہ اور عظمت حرمین کا شدتِ احساس تھا جس نے آپ پر بیت اللہ کے دروازے کھول دیئے تھے۔

اہلِ حرمین کی معنوی قدر وقیمت کا انہیں کتنا احساس تھا اس کا اندازہ تب ہوا کہ

جب ایک بار مدینہ منورہ میں میں نے مولانا سے حدیث ......ان الاسلام لیأ رزالی المدینة ۔(الحدیث) کے ضمن میں مدینہ منورہ میں حالات کی تبدیلی، دنیاوی ہنگامہ ہائے شب و روز اور اہلِ مدینہ کی پرتعیش زندگی اور عصری تہذیب کے اثرات کے فروغ کی طرف توجہ دلائی، وہ میرے خدشات کو بھانپ گئے اور فرمایا:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں فتن متتالیہ کے نزول اور ورود کی پیشگوئیاں بھی فرمائی تھیں اور اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے آج بھی اہلِ مدینہ ایمان کے مضبوط ترین رشتے اور رسی سے بندھے ہوئے ہیں اور مقامات میں روابط ایک کچے دھاگے کی طرح ہے جو ذرا سے جھٹکے سے کٹ جاتا ہے۔''

اس کے بعد کافی دیر تک مدینہ طیبہ کے انوار و برکات پر گفتگو فرماتے رہے۔ اس سفر کی خوشگوار یادوں میں مزید دو ایک باتیں یہ ہیں:

مولانا مرحوم حمیت دینی سے سرشار اور جذبہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے معمور تھے، ابطالِ باطل اور احقاقِ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، قادیانیت سے بغض و عداوت آپ کو اپنے مشائخ بالخصوص شیخ انور رحمۃ اللہ علیہ سے ورثہ میں ملی ہوئی تھی، مصر کے ایک سابق شیخ الازہر شیخ شلتوت رحمۃ اللہ علیہ کو مرزائی مبلغوں نے شیشہ میں اتار لیا، اور انہوں نے وفاتِ مسیح کے غلط عقیدہ میں مرزائیوں کی ہمنوائی کی، شیخ شلتوت کے رد میں ''نظرۃ عابرۃ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی، مولانا مرحوم کے ہاں اس کا نسخہ میری نظر سے گذرا تو اس کے ٹائٹل پر مولانا کے قلم سے لکھے ہوئے اس مختصر اور، لطیف ریمارکس سے بے حد لطف آیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات تھے:

"هـذه الرسالته النقتیة رد علی محمود شلتوت الذی مکنته الـظـروف مـن ان یـکـون شیـخـالـلا زهر فی هذا العهد المشئوم فیا ویل ادارة تکون مثله شیخا لها"

محمد یوسف البنوری عفا اللہ عنہ

ترجمہ: ''یہ قابل قدر رسالہ محمود شلتوت کے رد میں ہے جسے اتفاقاتِ زمانہ نے اس منحوس دور میں جامع ازہر کی مشیخت جیسے منصب پر فائز کیا ہے، ہائے افسوس ایسے ادارہ پر جس کا ڈائریکٹر محمود شلتوت جیسا شخص ہو۔''

دورانِ سفر ایک علمی گفتگو میں فرمایا:

''دائرۃ المعارف کا مصنف بستانی سب عیسائیوں میں کٹر متعصب ہے''

پھر بھی توحید و رسالت کا بڑا مواد کتاب میں بھر دیا ہے اور ہمارے مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ضرب الخاتم میں کئی جگہ حوالے دیے ہیں، فرمایا، معجم المصنفین میں آدم اول کے بعد ثانی آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ (مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مورثِ اعلیٰ) کے حالات ہیں۔

مجھے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے یہ اطلاع دی تھی جب کہ کتاب چھپی نہ تھی تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کتابوں پر بڑی گہری اور وسیع تھی، وہ کام کی کتابوں کا انتخاب فرما لیتے اور کارآمد مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے، ہمارے زمانہ طالب علمی میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی سرحد تشریف لاتے تو اپنے جگری دوست مولانا عبدالحق نافع گل رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کے ہاں لازماً زیارت کا کا صاحب اور سخا کوٹ تشریف لاتے اور کئی کئی دن ان کے لطائف اور ظرائف سے بھرپور محفلیں جمی رہتیں، ہم ایسے مواقع کو غنیمت سمجھتے اور موقع ملتا تو ان محفلوں سے لطف اندوز ہوتے، کسی علمی مسئلہ میں دونوں حضرات میں کبھی ٹھن جاتی تو ایسے مواقع پر اسیر مالٹا مولانا عزیز گل مدظلہ محاکمہ فرماتے۔

ایسے ہی ایک موقع پر ہمیں ادب عربی کے بنیادی کارآمد کتابوں کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

پہلے تو الهمدانی کی کتاب الالفاظ الکتابیه...... جو مترادفات کا مجموعہ ہے، کو ازبر کرلیں، پھر خود فرفر اس کے کئی ابواب یاد سے سنانے لگے، جو بچپن میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ازبر کرلیے تھے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ کتابیں بھی عربی استعداد کے لیے نہایت مفید ہیں:

١-ادب الکاتب لابن قتیبه

٢-البیان والتبیین للجاحظ

٣-صبح الاعشیٰ للقلقشندی

٤-نهایت الارب.

علم تفسیر اور فہم القرآن کے لیے آپ کشاف للزمخشری کے بالالتزام مطالعہ پر زور دیتے، اور فرماتے کہ حقیقۃ قرآن اور اس کی عربیت ادبیت اور اعجاز لفظی کے سمجھنے میں یہ نہایت اہم تفسیر ہے اس کے بعد تفسیر ابی اسعود کشاف کے قریب تر ہے اور اسی طرح تفسیر مدارک بھی، جس نے پوری دل جمعی اور غور وفکر سے کشاف اور پھر تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ کیا تو وہ اعلم الناس بالقرآن بن جائے گا۔''

مولانا اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ عربی جدید ہوگئی ہے البتہ موجودہ ادب عربی پر فرانسیسی طرزِ تحریر کے اثرات اور افسانوی طرزِ نگارش پیدا ہو جانے کے معترف تھے۔

مُفتی سیّاح الدّین کاکاخیل

یااسفیٰ علیٰ یوسف

مصائب لاکھ ہوں پر ''دل'' کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

یا ایتھا النفس اجملی جزعا
فان ما تحذرین قد وقعا

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ جو ۱۹۰۶ میں اس دنیائے آب وگل میں تشریف لائے تھے، ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو سی ایم ایچ ہسپتال راول پنڈی میں سوا پانچ بجے صبح واصل بہ حق ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس دنیا میں آنے والا ایک نہ ایک دن ضرور یہاں سے جاتا ہے اور سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے جاری ہے اور تا قیام قیامت جاری رہے گا لیکن بعض جانے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے چلے جانے سے فضا میں تاریکی پھیلتی ہے، دل گھبرانے لگتا ہے، ہر ایک صدمہ اور درد محسوس کرتا ہے اور جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے ایک اضطراب اور بے چینی اور وحشت کی کیفیت نظر آتی ہے، حضرت بنوری قدس سرہ العزیز کا یہ اچانک حادثہ بھی کچھ اس نوعیت کا تھا، اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاسوں میں شرکت

کے لیے میں بھی اسلام آباد حاضر ہوا تھا اور حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالی بھی ۱۳؍اکتوبر کی صبح کو کراچی سے تشریف لائے تھے، ۱۳؍اور ۱۴؍اکتوبر کو دونوں وقت کے اجلاسوں میں شرکت فرمائی اور مختلف مسائل پر اپنی حکیمانہ اور عارفانہ آراء سے ارکان کونسل کو مستفید فرمایا، ان کے علم وفضل اور سیرت وکردار کی بلندی اور وجاہت کی بنا پر کونسل میں ان کی عظمت واہمیت سب سے بڑھ کر نمایاں تھی اور ان کی رائے اور تجویز کی وقعت مسلم تھی، ۱۴؍اکتوبر کو رات دس بجے میٹنگ سے فارغ ہوکر وہ اپنی قیام گاہ تشریف لے گئے اور میں بھی اپنے مستقر چلا گیا، رات گذار کر صبح آٹھ بجے میں راولپنڈی آیا، پروگرام یہ تھا کہ گیارہ بجے ادارۂ تحقیقات اسلامیہ جا کر وہاں معائنہ کیا جائے گا، مولانا ظفر احمد انصاری، جناب خالد اسحاق صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی معیت میں جب کونسل کے دفتر میں گیارہ بجے پہنچا تو دوسرے ارکان تشریف لائے ہوئے تھے مگر حضرت مولاناؒ تشریف فرما نہیں تھے، ظاہر ہے ان کے بغیر محفل کی رونق نہیں تھی اس لیے میں نے پوچھا کہ کیا مولانا ابھی تشریف نہیں لائے، ان کا انتظار کر کے ادارہ میں جانا چاہیے، جناب محمد افضل چیمہ صاحب نے فرمایا کہ اطلاع آئی ہے کہ مولانا کچھ بیمار ہیں، یہ تفصیل ان کو بھی معلوم نہ تھی کہ بیماری کی نوعیت کیا ہے؟ سب نے بس یہی سمجھا کہ کچھ معمولی سی طبیعت کی خرابی ہوگی، جس کی وجہ سے انہوں نے ادارہ میں جانا ملتوی کر دیا ہوگا۔

ہم سب ادارۂ تحقیقات اسلامیہ گئے اور دو بجے وہاں سے واپسی ہوئی، جناب محمد افضل چیمہ صاحب نے اپنی کار میں مجھے ایم این اے ہوسٹل تک پہنچایا جہاں ہمارا قیام تھا، میں کار سے اترا تو مولانا کے صاحب زادے عزیزم مولوی سید محمد بنوری سلمہ اللہ تعالی مجھے لپک کر ادر روتے ہوئے ملے اور کہا کہ والد ماجد کو سخت تکلیف ہے، دل کا دورہ پڑا ہوا ہے، میں نے فوراً جناب چیمہ صاحب کو جو مجھے اتار کر جانے والے تھے آواز دی، وہ کار سے اترے اور ہم دونوں مولانا کے کمرے میں گئے، اس وقت اضطراب کی کیفیت تھی، بار

بارفرماتے تھے مجھے کبھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی، فرماتے تھے زیادہ تکلیف گلے سے اوپر ہے، کبھی فرماتے کہ غالباریاح غلیظ کا احتباس ہوگیا ہے، پیشانی پر پسینہ آتا رہااور خود کپڑے سے پونچھتے رہے، چیمہ صاحب نے پولی کلینک جاکرڈاکٹر سے بات کی، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ صبح آٹھ بجے جب ان کو دورہ پڑا تھا تو یہاں میرے پاس ان کو لے کرآئے تھے، میں نے تشخیص کر کے عرض کیا تھا کہ آپ یہاں داخل ہوجائیں مگرانہوں نے ہسپتال داخل ہونا پسند نہیں فرمایا، میں دوالکھ دی تھی شاید یہ پھر دوسرا حملہ ہوا ہے، آپ ان کو یہاں لے آئیں، میں ایمبولینس بھیج رہا ہوں، چیمہ صاحب نے واپس آکر مجھے اور دوسرے ان سب حضرات کو جو حضرت مولانا کے متعلقین ومعتقدین تھے اور وہاں جمع ہوگئے تھے ساری بات سنائی لیکن مشورہ کے بعد یہ طے کیا گیا کہ علاج کے لیے سی ایم ایچ اچھا رہے گا، چیمہ صاحب نے جنرل چشتی صاحب سے فون پر بات کی اورانہوں نے فرمایا سی ایم ایچ کو میں اطلاع دے رہا ہوں آپ فورا مولانا کو وہاں پہنچادیں، اس وقت آپ نہایت تکلیف میں تھے، بدن بہت ٹھنڈا ہورہا تھااور پسینہ بہت زیادہ آرہا تھا، ایمبولینس میں وہاں پہنچایااور قریبا۴ بجے ہسپتال کے عملہ نے ان کواپنی تحویل میں لے لیااور ہسپتال کے ضابطہ کے مطابق کوئی بھی اندران کے پاس نہیں رہ سکتا تھا، ۱۶رکو وہاں رہے، ۱۷رکو ۸ بجے عشاء کے وقت میں نے کونسل کے دفتر سے فون کر کے عزیزی محمد بنوری سے پوچھا مولانا کا کیا حال ہے؟ انہوں نے تسلی بخش جواب دیا، رات ۱۲ بجے ہماری میٹنگ ختم ہوئی، میں راول پنڈی آیااور پاکیزہ ہوٹل میں رات بسر کی، صبح ۸ بجے حضرت مولانا کی بیمار پرسی کے ارادہ سے سی ایم ایچ گیا، وہاں دیکھا بالکل سناٹا ہے، معلوم ہوا تھا کہ حضرت مولانا کے رشتہ دار اور دوسرے متعلقین ومعتقدین صبح سویرے حالات معلوم کرنے کے لیے ہسپتال آئے ہوئے ہیں مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا، میں نے اپنی قلبی خواہش کے مطابق یہ توجیہ کی شاید مولانا صحت یاب ہوکران کے ساتھ واپس مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے مدرسہ میں تشریف لے گئے

ہیں اور دل کے اندر ایک خوشی محسوس کی، اتنے میں باہر سے ایک مریض کو اندر داخل کرنے کے لیے دروازہ کھلا اور ہسپتال کی ایک نرس سامنے آئی اور میں نے دیکھا کہ ۱۵/اکتوبر کو ۴ بجے مولانا کو جو بستر دیا گیا تھا وہ خالی ہے، تو قلبی آرزو اور طبیعت کی خواہش کے مطابق حضرت مولانا کی صحت ہی کا تصور کر کے اپنی وہ توجیہ اور مؤکد کر دی کہ بحمد اللہ تعالی حضرت صحت یاب ہو کر تشریف لے گئے اور اس دل خوش کن اور روح افزا خبر سننے کے ہی ارادہ سے میں نے اس نرس سے پوچھا کہ کراچی والے مولانا بنوری جو پرسوں داخل کیے گئے تھے وہ کہاں چلے گئے، اس نے ہسپتال کی زبان میں فوراً کہا کہ ان کا تو آج صبح سوا پانچ بجے واقعتہً انتقال ہو گیا ہے، الفاظ سن کر اس کا مطلب تو میں سمجھ گیا، مگر چونکہ دل کسی بھی ایسی خبر کے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میرے دل نے فوراً کہا کہ یہ غلط کہہ رہی ہے، وہ سوا پانچ واقعتہً انتقال کر چکے ہوتے تو سوا آٹھ بجے تک یہاں ان کے عشاق اور جانثاروں کا ہجوم ہوتا، اس فضا میں ایسی خاموشی کہاں ہو سکتی تھی، یہاں تو سسکیاں ہوتیں اور رونے کی آوازیں:

فزعت فيه بآمالي الى الكذب

اس نے تو دروازہ بند کر دیا، میں صحت یابی کی مسرت افزا خبر سننے کی خاطر ہسپتال میں کسی اور کو تلاش کر رہا تھا دیکھا کہ ایک ایمبولینس کے پاس سفید کپڑوں میں ایک نوجوان کھڑا ہے اس سے پوچھا، اس نے تفصیل سے بات بتا دی کہ سوا پانچ بجے ان کی وفات ہوئی ہے، ہم نے جامعہ اسلامیہ راول پنڈی صدر فون کیا مگر معلوم نہیں کہ فون خراب تھا یا کسی نے اٹھایا نہیں، اس لیے ان کو اطلاع نہیں ہو سکی، اب ہم نے فوجی ہیڈ کوارٹر میں اطلاع کر دی ہے اور مولانا کو اپنے اس بستر سے دوسری جگہ لے جا کر رکھا ہے، اس نے خبر اس تفصیل و یقین کے ساتھ سنا دی کہ میری توجیہ تاویل کے سارے بند ٹوٹ گئے اور اس حادثہ فاجعہ اور سانحہ کبری کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہ رہا اور آنسو جاری ہو گئے:

حتی اذا لم یدع لی صدقه املا　　شرقت بالدمع حتی کاد یشرق بی
لغی لی ابو المقدام ما سود منظری　　من الارض واستکت علی المسامع
وأقبل ماء العین من کل زفرة　　اذا وردت لم تستطعها الاضائع

غم واندوہ کا لاوا پھوٹ پڑا اور حزن وملال کا ایک سیلاب امنڈ آیا، طبیعت بے قابو ہوگئی، مگر اس اضطراب و بے چینی کے عالم میں آیات کریمہ کی طرف توجہ ہوگئی، ﴿اذا اُصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون﴾ کے ارشاد خداوندی کا استحضار ہوا، بار بار انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد معانی کو ذہن میں حاضر کر کے شروع کیا، اتنے میں دیکھا کہ جناب سردار میر عالم خان لغاری صاحب تشریف لے آئے، دور سے دیکھا تو ان کا چہرہ غمزدہ اور پرمژدہ تھا، علیک سلیک ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے عیادت ہی کے خیال سے آئے تھے اور انہوں نے یہ غم انگیز اور صبر شکن خبر پہلے سنی تھی مگر وہ اعزاء واحباب کو اطلاع دینے کے لیے گئے مگر ان میں سے کوئی نہیں ملا، وہ حضرات صبح سے دل کے امراض کے خصوصی ماہر ڈاکٹر ذوالفقار صاحب کی تلاش میں نکلے ہیں کہ مولانا کا علاج ان سے کرایا جائے اور وہ شاید ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہ کر سکے اور ان کو ڈھونڈ رہے ہیں، کچھ دیر بعد جناب افضل چیمہ صاحب فوجی ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملنے پر تشریف لے آئے اور شہر کے علماء اور مدارس عربیہ کے طلبہ اور دوسرے معتقدین کی آمد شروع ہوئی جہاں حضرت مولانا کا جسد مبارک ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا ہم وہاں گئے اور پلنگ پر آپ کو آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا دیکھ کر بے اختیار جی بھر آیا اور طبیعت کی کچھ ایسی کیفیت ہوئی کہ جذبات رنج وغم کی شدت نے میرے حافظے کو تیز کیا اور کبھی کے پڑھے ہوئے اور یاد کیے ہوئے اشعار یاد آنے لگے:

علیك سلام الله قیس بن عاصما　　ورحمته ما شاء أن یترحما
تحیة من غادرته غرض الروی　　اذا زار عن شحط بلادك سلمها

اور اس کے بعد وہ مشہور و متبذل شعر جو شاعر کی قلبی درد مندی کی صحیح ترجمانی کی بنا پر ایک بقائے دوام حاصل کر چکا ہے اور حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ جیسی عظیم شخصیتوں کی مفارقت کے موقع پر اس کا پڑھنا ایک اظہار حقیقت اور امر واقعہ کا بیان ہے بار بار پڑھتا رہا:

فما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تهدما

اس شعر کے دہرانے کے ساتھ ساتھ ذہن میں اس لفظ قوم کے وسیع معانی تازہ ہو رہے تھے، یہ قیس بن عاصم جو اس وقت یوسف بن زکریا ہے جدا ہوا تو پوری قوم کی عمارت منہدم ہوگئی، قوم سے مراد پوری مسلمان قوم ہے، قوم سے مراد پاکستانی مسلمان قوم بھی ہے، قوم سے مراد علماء کرام کی جماعت بھی ہے، قوم سے مراد مدارس دینیہ کے طلبہ بھی ہیں، قوم سے مراد مجلس عمل بھی ہے، قوم سے مراد مجلس تحفظ ختم نبوت بھی ہے، قوم سے مراد جمعیت وفاق المدارس العربیہ بھی ہے اور قوم سے مراد جمعیت علمائے اسلام بھی ہے، اور قوم سے مراد اسلامی نظریاتی کونسل بھی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر عمارت میں کچھ دراڑ پڑ گئی اور مولانا کے چہرۂ انور پر نظر ڈال کر کہنا پڑا:

فان تك قد فارقتنا وتركتنا

ذوي خلة ما في انسداد لها طمع

مشہور اردو شاعر جگن ناتھ آزاد نے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا، اس کے چند شعر حافظہ میں تازہ ہو گئے، مقتضی الحال کے مطابق اور قلبی واردات و جذبات کی ترجمانی کے لیے مناسب جان کر ایک طرف ہو کر گنگنانے لگا:

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی وہ خبر آئی کہ بزم زندگی تھرا گئی

روشنی جس کی حریم روح کو چمکا گئی ظلمت مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے منور تھے دماغ بجھ گیا وہ علم کا حکمت کا دانش کا چراغ
اے غلاموں کا لہو گرمانے والے الوداع ! آگ سی الفاظ میں برسانے والے الوداع !
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے الوداع ! اے جگا کر ملک کو سوجانے والے الوداع!

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اتنے میں عزیزم محمد بنوری اور قاری سعید الرحمٰن صاحب وہاں پہنچ گئے ، محمد بنوری شدت غم سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے ، ہم سب اس نوجوان عزیز کو سہارا دینے اور صبر واستقامت کی تلقین کرتے تھے مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی دنیا اجڑ گئی ، غم کا پہاڑ اس کی جان ناتواں پر آپڑا تھا ، حضرت مولاناؒ کے خواہرزادہ اور داماد عزیزم خالد بنوری بھی بہتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو اپنی جلادت اور اصبر واستقامت سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بے قابو ہوکر آنسو بہا رہا تھا ، اس وقت ہسپتال میں تمام حاضرین کی جو کیفیت تھی الفاظ میں اس کا نقشہ نہیں کھینچا جاسکتا اور یہ کیفیت کیوں نہ ہوتی جبکہ:

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان ہم پری ہم اہرمن بگریستے

والی صورت حال پیش آئی تھی ، جنازہ کہاں پڑھا جائے ؟ تدفین کہاں ہو؟ اس کے لیے اہل کراچی سے مشورہ کرنا ضروری تھا ، اس لیے جناب چیمہ صاحب فون پر کراچی والوں سے مشورہ اور فیصلہ کرنے کے لیے حضرت مولاناؒ کے بہنوئی مولانا محمد ایوب جان صاحب بنوری ، مولاناؒ کے داماد اور خواہرزادہ عزیزم خالد بنوری اور صاحب زادے مولوی سید محمد بنوری کو اپنے ساتھ شہر لے گئے اور ہم سب وہاں بادل بریاں ودیدۂ گریاں ہسپتال میں بیٹھے رہے ، مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد شریف صاحب جالندھری آپ کی بیماری کی خبر پاکر ملتان سے ۱۶/اکتوبر کو تشریف لائے تھے وہ بھی وہاں

موجود تھے، مولانا غلام حیدر صاحب جو اسلام آباد میں دفتر مجلس ختم نبوت کے انچارج ہیں اور جنہوں نے اس سفر میں مولاناؒ کی خدمت سرانجام دیں وہ بھی مغموم اور پژمردہ وہاں تشریف فرما تھے، شہر سے مدارس عربیہ کے اساتذہ اور طلبہ بھی جوق در جوق وہاں آ کر حضرت مولاناؒ کے جسد مبارک کی زیارت کرتے اور آنسو بہاتے تھے، میں بھی ان حضرات کے ساتھ محزون ورنجیدہ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا، کہ یا اللہ! یہ بالکل اچانک کیا ہوگیا، اسلامی نظریاتی کونسل کے ذریعہ اسلامی قوانین کی تدوین وترتیب میں حضرت مولانا کے علم وفضل اور محدثانہ اور فقیہانہ مہارت سے استفادہ کرنے کے ہم کیا کیا خواب دیکھ رہے تھے وہ سب کے سب شرمندۂ تعبیر ہو گئے:

زندگی جس کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

آپ کے فیوضات علمی اور حکیمانہ نکتہ آفرینیوں اور ہر مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنا کر وہ مشکل مسئلہ حل کرنے سے اب مستقل محرومی کا تصور آنے لگتا تو بے اختیار دل کی ایک عجیب کیفیت ہو جاتی:

نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

اور

بیٹھے بیٹھے امنڈنے لگتا ہے
دل کو کیا ہوگیا خدا جانے

انہی تصورات وتفکرات میں گم تھا کہ قوت حافظہ نے ماضی کے واقعات یاد دلائے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت ومحبت قلبی تعلق قائم ہونے کی سابقہ تاریخ سامنے آئی اور وہاں بیٹھے بیٹھے دماغ سوچتا رہا اور ماضی کے حالات وواقعات کے بے شمار اوراق الٹا تارہا، ۱۹۳۱ء میں جب حضرت مولاناؒ کی عمر ۲۵ برس تھی،

استاذ محترم ومکرم حضرت مولانا عبدالحق صاحب نافع قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ آپ کی دوستی، محبت بلکہ اخوت کا تعلق قائم ہوا تھا اور ان کے واسطہ سے میں بھی اس نو جوان عالم وفاضل اور اس وقت کے ممتاز ادیب سے متعارف ہوا اور نیاز مندوں کے حلقہ میں شامل ہوا تھا، مولانا ہمارے قصبہ زیارت کا کا صاحب تشریف لائے اور بہت دنوں تک ان دونوں فضلائے دہر کی علمی مجلسیں رہتیں، میں ۱۵ برس کا کم عمر طالب علم تھا مگر ان علمی مجالس میں مستقل طور سے شریک ہو کر اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرتا تھا اور مجھے علمی مجلس میں بہت لطف آتا تھا، بیٹھے بیٹھے وہ دن یاد آئے اور اس کی یاد نے رلایا۔

پھر حافظہ نے یاد دلایا کہ ۳۲ء میں جبکہ آپ کی عمر صرف ۲۶ سال تھی، صحت قبلہ کی تعیین کے مسئلے کے سلسلہ میں ایک استفتاء کا علمی جواب لکھنا شروع کیا تو لکھتے لکھتے وہ ایک مختصر فتوی کے بجائے مسئلہ قبلہ پر ایک مستقل رسالہ بن گیا، جس کا کچھ تفصیلی ذکر آگے کروں گا، اس رسالہ کے مضامین اور عبارات مولانا نافعؒ کو سناتے، مسائل کی تحقیق ہوتی، کتابوں کے حوالے نکالے جاتے تھے اور مجھے یاد آیا کہ مسلسل بارہ دن تک زیارت میں رہ کر آپ نے اس رسالہ کی تکمیل کی۔

پھر ایک علمی درس گاہ قائم کرنے کا شوق ہوا کہ اپنے علمی فیوض کو عام کریں، ۱۹۳۲ء میں پشاور شہر میں یکہ توت دروازہ کے اندر ایک قدیم مدرسہ کی عمارت کو ناجائز مکینوں سے خالی کرا کر وہاں مدرسہ قائم کیا اور مولانا نافعؒ اور مولانا لطف اللہ مدظلہ کو ساتھ ملا کر تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، طلبہ کا ہجوم ہو گیا، اسی دوران میں پشاور چھاؤنی میں انگریز حکومت تعمیر کے نئے نقشے میں ایک قدیم مسجد گرا رہی تھی اس پر ان حضرات نے انگریزوں کی مزاحمت کی، بڑی کش مکش ہوئی، آپ نے اور آپ کے ان رفقاء نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حکومت مجبور ہوئی کہ نقشہ بدل دے اور مسجد بحالہ قائم رہے، ۱۹۳۲ء میں انگریز کی مخالفت کرنا اور اس کے نتائج وعواقب سے بے پرواہ ہو کر مقابلہ میں

ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس دور کے نوجوان ان حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتے، انگریز نے اپنی خفیہ شیطانی سیاست چلائی اور ایسے طریقے استعمال کیے کہ تدریجاً مدرسے کو نقصان پہنچایا۔

اس دور کا یہ سارا نقشہ اور آپ کے علمی کارناموں کے ساتھ عملی صلاحیتوں کے یہ سارے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے، اس دور میں قادیانیوں کے خلاف بھی کام کیا اور پشاور میں قادیانی افسروں کی وجہ سے اس گمراہ طبقہ کے جو اثرات پھیل رہے تھے ان کو ختم کر دیا، شب و روز اسی جدوجہد میں لگے رہتے تھے، حضرت مولانا نافعؒ کے واسطہ سے میں ان تمام واقعات سے باخبر رہتا تھا، تفصیلات کا موقع نہیں۔

اس وقت میں صرف آپ کے ایک علمی کارنامے کا ذکر کروں گا، ۳۲ء میں سمت قبلہ کے مسئلے پر جو رسالہ لکھا تھا جو اس موضوع پر بے نظیر و بے مثال اور جامع رسالہ ہے اس کے حوالوں کی تکمیل اور مزید اضافہ کرنے کے لیے کچھ نایاب علمی کتابوں کے مطالعہ کے لیے آپ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، میں اس سال حضرت مولانا نافعؒ کے زیر سایہ دارالعلوم میں داخل ہو کر اکابر اساتذہ سے استفادہ کر رہا تھا، مولانا نافعؒ اپنے بڑے صاحب زادے عبداللہ متوفی کی بیماری کی وجہ سے وطن تشریف لے گئے تھے تو دو ماہ تک میں ہی حضرت مولاناؒ کی خدمت و مہمان نوازی کرتا رہا، مجھے دو ماہ کے اس عرصے میں آپ کی سیرت و اخلاق، بلند کردار، سیر چشمی، اخلاص و للّٰہیت، سخاوت، شفقت اور علمی کمالات و فضائل کا اندازہ ہوا اور عقیدت و محبت اور راسخ ہوگئی، یہ جتنے عنوانات میں نے ذکر کیے ہیں ان میں سے ہر ایک پر سیر حاصل اور طویل مضمون لکھ سکتا ہوں اور واقعات و شواہد پیش کر سکتا ہوں۔

آپ کی طبعی نفاست اور کھانے پینے، پہننے میں شائستگی اور نظافت کے اہتمام کا پورا اندازہ ہوا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، آپ کا ایک خاص وصف جس کا

ادراک شاید عام شناساؤں کو نہ ہو وہ یہ تھا کہ اپنی قوت ادراک کی بناء پر جو ہر قابل اور ذہین وفطین اور ذکی شخص کو خوب پہچانتے تھے اور اس کی ذہانت وذکاوت اور علمی قابلیت کی قدر بھی کرتے تھے، عالم شناس بھی تھے اور عالم پرور بھی۔

دو ماہ کا عرصہ دارالعلوم دیوبند میں یوں گذارا کہ کتب خانہ جا کر مطالعہ کرتے اور نوادر کتب سے استقراءِ تام اور تتبع کامل کے بعد اپنے موضوع سے متعلق حوالے نکالتے اور اپنے رسالہ میں اضافہ فرماتے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے مسئلہ قبلہ ومحاریب کے سلسلے میں العرف الشذی کی تقریر ترمذی میں مقریزیؒ کی کتاب الخطط والآثار پر ایک مجمل سا حوالہ دیا تھا، آپ نے کتب خانہ سے وہ کتاب نکلوائی اور تلاش کر کے پورا حوالہ نکال کر وہ عبارت درج کر دی، آپ کی برکت سے میں بھی ان دنوں مقریزی کی یہ تاریخ مطالعہ کی اور اس سے نوٹ لیے، اس مسئلہ کے مستفتی مولانا عبدالسلام صاحب نے ۱۹۳۳ء میں یہ استفتاء حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا، حضرت کاشمیری کی وفات سے چند دن پہلے کی یہ بات ہے، انہوں نے جواب لکھا اور شیخ اسماعیل بن مصطفیٰ کلنبوی ایک ترکی عالم کے ایک رسالے کا حوالہ دیا اور لکھا کہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ عارف حکمت میں ہے، میں نے وہ رسالہ مطالعہ کیا تھا، قلمی رسالہ تھا، میں نے اس کی عبارتیں اپنے پاس نقل کی ہیں، مگر بیماری کی وجہ سے میں اسے تلاش نہیں کر سکتا، مگر مجھے یاد ہے کہ انہوں نے یوں لکھا، حضرت مولانا کو جو علامہ محدث کشمیری کے تلمیذ خاص اور خصوصی نشانی تھے ۱۹۳۴ء میں حضرت کی وفات کے بعد ان عبارات کی تلاش ہوئی اور شاہ صاحب کی یادداشتوں کے ذخیرہ میں وہ منقولہ عبارت مل گئیں جس کا ذکر آپ نے رسالہ کے خاتمہ میں کیا ہے، یہ رسالہ ہر طرح سے مکمل کرنے کے بعد آپ نے اکابر علماء دیوبند سے اس پر تقریظ وتصدیق حاصل کی۔

آپ نے خود اپنے ادیبانہ ذوق کی بنا پر رسالے کا نام تجویز کیا تھا: ''قُبلۃ

المصلی فی قِبلۃ المصلی'' (اول مصلی سے مراد گھوڑ دوڑ میں اول نمبر پر آنے والا گھوڑا اور دوسرے مصلی سے مراد نماز پڑھنے والا ہے) آپ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے ہاں تھانہ بھون تشریف لے گئے اور رسالہ پیش کیا، حضرت نے مطالعہ کر کے بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ آپ نے نام تو بہت اچھا رکھا ہے مگر عام لوگ اس کے معنی کو نہیں سمجھیں گے اس لیے میری رائے ہے کہ آپ اس کا نام رکھیے: ''بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب'' چنانچہ آپ نے حضرت کا ارشاد قبول کر کے یہی نام رکھا اور اسی نام سے پھر ۱۹۳۸ء میں مصر میں جا کر طبع کیا، اس بے نظیر علمی رسالہ کی تصدیق و توثیق کے سلسلہ میں حضرات اکابر علمائے دیوبند نے جو کچھ لکھا ان میں سے صرف وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو آپ کے اسم گرامی کے ساتھ انہوں نے بہ طور تعریف و تعارف ذکر فرمائے ہیں اور اسی سے آپ قارئین اندازہ لگائیں کہ ان اکابر علماء اور اساطین امت کی نگاہوں میں ۲۸ برس کا ایک نوجوان عالم علم و فضل کے کس بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تحریر فرمایا:

"ألفها أخونا فی الله المحترم العلامه السید محمد یوسف البنوری بلغه الله الی أقصی مایتمناه فی الدارین".

حضرت مدنیؒ کی یہ دعا قبول ہوئی اور علمی و عملی طور پر اس دنیا میں آپ جو کچھ بننے کی تمنا فرماتے تھے اللہ تعالی نے وہاں تک پہنچایا اور امید کامل ہے کہ دار آخرت میں بھی اقصی ما یتمنا تک پہنچیں گے۔

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے لکھا:

"صنفها أخی العلامة السید محمد یوسف البنوری البشاوری وهو من أماثل القرن الحاضر أدام الله فیضه ونفع برسالته".

مفتی صاحبؒ کی یہ دعا بھی بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی اور آپ کا فیض علمی معارف السنن اور ہزاروں تلامذہ اور جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کی شکل میں جاری ہے اور انشاءاللہ جاری رہے گا۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

"ان مولانا محمد یوسف البنوری أدام الله فضله من أرشد تلامذه حضرة المحدث مولانا محمد انور شاه قدس سره العزيز ومن اعز اصحابه ارجو الله سبحانه أن يوفق المؤلف لاشاله ويسعفه بمقاصده في الدارين".

اس عارف کامل کی دعا کا اثر ہے کہ مولانا مرحوم نے معارف السنن جیسی کتاب لکھی اور اپنے مقصد میں اس دار دنیا میں کامیاب ہوئے اور انشاء اللہ آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے۔

استاذ العلماء حضرت مولانا رسول خان صاحب نے اپنی تقریظ میں لکھا:

"ألفها المحقق العلامة محمد يوسف البشاوری جزاه الله عنا وعن سائر المسلمين خير الجزاء.

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم نزیل کراچی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا:

"مؤلفها المحقق العلامة التقى النقى المولى محمد يوسف البشاورى اوصله الله تعالى الى ما يتمناه فى دنيا وأخراه".

حضرت بنوری کے اعز معارف واصدقاء الاخ فی اللہ الفاضل المحقق حضرت مولانا عبدالحق نافع کاکاخیل قدس سرہ العزیز نے جو اس رسالہ کے ایک ایک جملہ پر بحث

کر چکے تھے انہوں نے اپنی تقریظ میں تحریر فرمایا:

"نتیجة فکرة الفاضل المحترم والنحریر الافخم صدیقنا واخینا فی اللہ مولانا محمد یوسف لازالت مساعیھم مشکورۃ وفیوضھم ماجورۃ".

خط کشیدہ الفاظ پڑھیے، دیکھا آپ نے ان اکابر کی نظر میں ۲۸ سال کا یہ نوعمر فاضل علامہ، محقق، من اماثل القرن الحاضر، من ارشد تلامذہ المحدث الکشمیری ومن اعز اصحابہ، التقی النقی، الفاضل المحترم اور النحریر الافخم میں اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس کو ان بزرگوں نے اتنی دعائیں دی ہوں وہ آگے جاکر مزید مطالعہ، تجربہ، تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کے نتیجہ میں کیا کچھ بنے ہوں گے، تو ہسپتال میں بیٹھے بیٹھے میں یہ ساری باتیں سوچتا رہا اور اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ آج ۱۷/۱۰/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اس متاع گرانمایہ سے ہم محروم ہو گئے تو یہ ہماری کس قدر بدبختی ہے، ۲۸ سال کا نوجوان جوان القاب کا اکابر کی زبان میں مستحق تھا تو ۷۱ برس کی عمر میں اس کے حق میں کیا کیا القاب استعمال کیے جاسکتے ہیں، تو کیا ایسے علامہ، محقق، فاضل، تقی، نقی، مصنف، مؤلف، محدث، مفسر اور فقیہہ وادیب کی یہ مفارقت اس سال کا عظیم سانحہ اور قیامت صغریٰ نہیں! اگر اس پر رونا نہ آئے تو پھر رونا کس پر آئے گا۔

مولانا شمس الحق افغانی

علّامہ کشمیری کی تصویر

مولانا مرحوم میرے ہم وطن تھے اور ان کے والد ماجد مولانا محمد زکریا صاحب (مرحوم) سے بھی احقر کا تعلق رہا، مولانا سید محمد یوسف (مرحوم) عمر میں مجھ سے تقریباً دس سال چھوٹے تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں جب مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ قیام پاکستان کی جدوجہد میں مشغول ہوئے تو احقر کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اپنا قائم مقام بنایا، ان ایام میں مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم مجلس علمی میں حضرت علامہ کشمیری کے علوم مدون کرنے کے کام میں مصروف تھے، چونکہ ڈابھیل اور مجلس علمی باہم پیوست ہیں، اس لیے فراغت کے اوقات میں مرحوم اکثر جامعہ ڈابھیل تشریف لاتے اور علمی مجلس گرم رہتی تھی، طبقاتی تقدم کی وجہ سے حضرت مرحوم اگرچہ حسب عادت احقر کا بہت احترام کرتے تھے لیکن میں ان سے کہتا تھا کہ تم نے حضرت شیخ الاسلام کشمیریؒ کا پکا پھل کھایا ہے اور ہم نے کچا پھل کھایا ہے، وہ ہنس کر فرماتے تھے: والفضل للمتقدم۔

مولانا مرحوم اپنے علامہ کشمیریؒ سے ان امور میں کافی مشابہت رکھتے تھے:

۱- ترک دنیا خشیۃ اللہ ۲- تواضع

۳- انسداد فتنہ دینیہ کے لیے جذبۂ جہاد، خواہ قادیانیت ہو یا پرویزیت یا نیچریت، حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ کسی بلند ترین مشہور تر شخصیت کے اندر بھی کوئی دینی نقص ہو، اس کو برملا تقریر اور تحریر سے ظاہر کر کے اس کی اشاعت کرتے تھے، یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی سخت تنقید کی، اظہار حق میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی، حضرت مرحوم

کی بہتر یادگار یہ ہے کہ جس نہج پر انہوں نے اسلام کی خدمت کی ہے اس کی تکمیل کی جائے۔

۱-ان کی شرح ترمذی معارف السنن جس کی چھ جلدیں چھپ چکی ہیں، اگر ان کی قلم سے لکھی ہوئی کوئی اور جلد ہو اس کو بھی چھاپ کر اشاعت کی جائے، میں پیرانہ سالی اور ہجوم امراض کی وجہ سے اس خدمت سے عاجز ہوں، لہذا علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جائے جن کو فن حدیث، فن رجال، فن اصول حدیث، اصول فقہ اور فقہ حنفی فقہ جامع پر عبور حاصل ہو اور اکابر علماء دیوبند کے ذوق علمی سے مناسبت رکھتے ہوں، وہ حضرات معارف السنن کی تکمیل کر دیں، تا کہ پوری شرح مولانا مرحوم کے انداز پر علماء کے سامنے آجائے۔

۲-کل جدید فتنہ دینیہ کے لیے مولانا مرحوم کی طرح تصنیف وتحریر کے ذریعہ مساعی جاری رکھیں۔

۳-عربی مدارس کے لیے توکل علی اللہ اور قناعت کے رنگ میں احیاء علوم اسلامیہ کی کوشش جاری رکھیں کہ نہ سالانہ جلسوں کی نمائش ہو نہ اشتہارات نہ سفیروں کا ہجوم، بلکہ تقوی اور اعتماد علی اللہ کے سرمایہ سے مدارس کا کام چلایا جائے۔

میں مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے ملائیشیا کوالالمپور جانے کے لیے جب ملتان سے کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو دیگر علماء کے علاوہ مولانا مرحوم بھی ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔

آپ کے ہاں رات کی دعوت میں احقر کی ملاقات کے لیے مختلف حضرات بھی کھانے میں شریک تھے، دسترخوان پر مولانا مرحوم نے مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہا کہ میرے ہاں مدرسہ کی طرف سے مہمانی کا کوئی شعبہ نہیں ہے، یہ سب میرے جیب خاص کا خرچ ہے، ہزاروں روپے کے چیک بمد زکوۃ مولانا واپس کرتے تھے کہ ہمارے مدرسہ میں مصرف زکوۃ نہیں، پھر وہ حضرات چیک واپس اس تحریر کے ساتھ بھیجتے کہ آپ حسب صواب دید خود مصارف شرعیہ کسی اور جگہ مستحق لوگوں میں تقسیم کریں، مولانا پھر واپس کرتے کہ آپ خود تقسیم کریں، یہ بوجھ ہم پر کیوں ڈالتے ہو۔

ڈاکٹر صغیر حسین معصومیؒ



برصغیر پاک و ہند میں علوم اسلامیہ کی ترویج اور علوم دینیہ کی تعلیم درحقیقت بڑی حد تک قدامت پسند علماء کی رہین منت ہے جدید جامعات میں اگر تھوڑا بہت ان کا وجود نظر آتا ہے، تو وہ بھی پرانی ثقافت کے حاملین کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے، جدید ثقافت کے علم برداروں کی یونیورسٹیوں میں، اسلامیات ومعارف اسلامیہ کے نام سے ایک آدھ شعبہ تو موجود ہے مگر وہاں حفظِ القرآن وتجوید یا روایتِ حدیث اور علوم نقلیہ کی ترویج کا سامان کہاں؟ کچھ تھوڑی بہت جو دینی تعلیم بروقت ہو رہی ہے اس کا جو معیار ہے وہ ظاہر ہے، مدارس کے محصلین کو دینی علوم میں جو کچھ شُدبُد حاصل ہے جامعات کے محصلین میں وہ بھی مفقود ہے، الّا ماشاء اللہ، جن لوگوں کو موقع ملا کہ مدارس سے فراغت حاصل کر کے یونیورسٹی میں پہنچ گئے وہی کچھ بھرم رکھے ہوئے ہیں، اس زمانے میں حکومت مصر کے بھیجے ہوئے اساتذہ جو مختلف مدارس میں عربی زبان کی تعلیم دینے لگے ہیں۔ ان کی موجودگی سے بھی مدارس اسلامیہ ہی کے طلباً زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور عربی بول چال کی مشق بہم پہنچا رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری پاکستان کے عربی مدارس کے وفاق کے صدر کی حیثیت سے علوم دینی کی ترویج میں اس سرزمین کے سرخیل تھے، افسوس وصد افسوس! کہ

ایسے نازک دور میں جبکہ پاکستان اپنی نشأۃ ثانیہ کی طرف گامزن ہے اور مارشل لاء (قانون عسکری) کی بدولت حیاتِ نو میں اپنی زیست کے سامان میں ہمہ تن کوشاں ہے، ملک ایسے دینی رہنما سے محروم ہوگیا، یہ واقعہ یقیناً ایک سانحۂ عظیم ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

راقم الحروف دسمبر ۱۹٦۰ء سے پہلے جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں فلسفہ عربی اور معارفِ اسلامیہ کے شعبوں میں فلسفۂ اسلام اور عربی و دینی علوم کی تدریس میں مشغول تھا تو مولانا بنوری کی علمی خدمات کی شہرت مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں سن چکا تھا، اس عرصہ میں راقم کے علمی مقالات اور تحقیقی تعلیقات عربی میں منتقل کرنے کے بعد حکومت شام کی وزارت تعلیم وارشادقومی کے زیرسرپرستی شائع ہونے والے علمی مجلّہ "مجلة المجمع العلمی العربی بدمشق" میں بالاقساط شائع ہورہے تھے، ۱۹۵۷ء کے ایک شمارے میں مولانا بنوری کا مقالہ دیکھ کے بے حد مسرور ہوا، کہ یہ اولین موقعہ تھا کہ مولانا کے تحریری کارنامے سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا، اس مقالے کا عنوان تھا "الترمذی صاحب الجامع فی السنن"، اس مقالے میں امام ابوعیسٰی ترمذی (المتوفی ۲۷۹ھ) کے مختصر حالات، اور زیادہ تر ان کی مشہور عالم جامع کے خصائص سے بحث ہے، اور امام ترمذی کی روایتوں، حفظ وجمع حدیث اور ان کی اپنی آراء کے متعلق ان کے معاصرین سے لے کر علامہ سیوطی اور شیخ زاہد الکوثری تک کے اقوال جمع کردیے گئے ہیں۔

اواخر ۱۹٦۳ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی سے جو اس وقت مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نام سے مشہور تھا، راقم کے وابستہ ہونے پر مولانا سے کئی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا ڈاکٹر افضل الرحمٰن سابق ڈائریکٹر ادارہ کی دعوت پر مولانا ایک بار ادارے میں تشریف لائے اور اپنے خیالات سے کارکنانِ ادارہ کو مستفیض فرمایا۔ امید

تھی کہ یہ رابطہ قائم رہے گا، مگر بعد میں کچھ ایسے سیاسی اور ثقافتی مسائل معرض بحث میں آئے کہ ان کا رابطہ قائم نہ رہ سکا، اور پھر ادارہ بھی راولپنڈی اور بعد میں اسلام آباد منتقل ہوگیا۔

فیلڈ مارشل ایوب کے آخری دور میں اواخر ۱۹٦۸ء سے جب یہ راقم ڈائیریکٹر ہوا تو حضرت مولانا ادارے کے تحقیقی کاموں میں برابر دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے، چنانچہ امام فخرالدین رازی کی نایاب تالیف ''کتاب النفس والروح و شرح قواھما'' کی اشاعت کے بعد اسی راقم کی تحقیق کردہ تیسری صدی ہجری کے مشہور حنفی محدث وفقیہ امام ابوجعفر طحاوی کی نادرروزگار کتاب "اختلاف الفقھاء" جلداول کی اشاعت پر حضرت مولانا نے اپنے ماہنامہ بینات بابت رجب المرجب ۱۳۹٦ء ص ۳۱ میں حسب ذیل تبصرہ سپردقلم فرمایا:

> ''ادارۂ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد نے امام طحاوی کی کتاب "اختلاف الفقھاء " کا ایک قطعہ جوشائع کیا ہے یہ ادارہ کی قابل قدر خدمت ہے اور علمی کتب خانہ میں قابل قدر اضافہ ہے، کاش ابتداء ہی سے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان کا رُخ اس طرف ہوتا تو اب تک خاصہ بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا، اوراس وقت تک جو ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ اس ادارہ پر خرچ ہو چکا ہے اس کا قابلِ ذکر نتیجہ سامنے آجاتا، اگر سابق ڈاکٹر اور ڈائریکٹر کی توجہ اس طرف مبذول ہوتی تو ادارہ تحقیقات کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔
>
> ڈاکٹر صغیر حسن صاحب معصومی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف نے اس کتاب کو حاصل کر کے بہت عرق ریزی سے اسکو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک قابل قدر بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جو

بجائے خود ایک نہایت مفید مقالہ ہے، مقدمہ میں ائمہٗ اجتہاد کے اختلافات کی اہمیت اور تفقہ واجتہاد کے باب کی ضرورت واہمیت کو واضح فرمایا، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اصول وعقائد میں اختلاف تو عذابِ الٰہی ہے، لیکن فروعی مسائل میں اختلاف بلاشبہ رحمت الٰہی ہے...... بہرصورت کسی قلمی ''مخطوطہ'' کو طباعت کے لیے آراستہ کرنے اور مقدمات لکھ کر ان کو نافع سے نافع تر بنانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اس کی حقیقت وہی شخص جانتا ہے جو ان صحراؤں کی بادیہ پیائی کر چکا ہو

در بیاباں گرز شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرز نشہا کند خار مغیلاں غم مخور''

جولائی ۱۹۷۵ء سے جب یہ راقم الحروف ادارے سے الگ کر دیا گیا تو اس خبر سے حضرت مولانا کو بے حد قلق ہوا، اور باوجود یہ کہ عندالملاقات بے تکان عربی میں خطاب کیا کرتے تھے اس خبر کا تأثر اتنا غالب ہوا کہ حسرت وافسوس کے اظہار کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

حضرت مولانا کی تالیفات میں سب سے ضخیم ''جامع ترمذی'' کی شرح ہے جو "معارف السنن شرح سنن الترمذی" کے عنوان سے چھ جلدوں میں اب تک شائع ہوئی ہے، یہ شرح درحقیقت اپنے استاذ کی تقریر "العـــرف الشذی" پر حاشیہ آرائی کی کوشش ہے، جس میں جابجا اپنے اساتذہ کی فقہی حجتوں کی تائید میں بعض دوسرے مسلک کے شارحین کے نقایض پر جرح وقدح بھی کی گئی ہے مثلاً صفحات ۲٦-۲۷، ۲۵۹، ۴۸۱ پر بیہقی ہند مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کی شہرۂ آفاق شرح "تحفة الاحوذی" کے بعض ایرادات پر نقد ہے، مسائل کی تشریح، رواۃ واسناد کی تفصیل، مختلف اقوال کا استقصاء اس

شرح کا طرۂ امتیاز ہے، مولانا نے اپنی اس شرح میں صحاح ستہ کی ساری مشہور شروح کے معرکۃ الآراء مذاہب اور روایت ودرایت کے نکات کو بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اس طرح یہ شرح مختلف علوم کا دائرہ معارف (انسائیکلو پیڈیا) معلوم ہوتی ہے، غرض فروعی اور جزئی مباحث کا ضخیم مجموعہ ہے، مصادر ومراجع کے ذکر کے ساتھ اگر صفحات، طباعت و اشاعت نیز مطابع کے بعض اہم جزئی خصوصیات کی طرف اجمالی اشارہ بھی ہوتا تو کتاب کی اہمیت وقیمت میں بیش بہا اضافہ ہوتا، اور اس کی افادیت میں چار چاند لگ جاتے۔

دستور پاکستان میں قادیانیت کو خارج از اسلام قرار دینے کی دفعہ کو داخل کرنے میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل ہے، ان کی انتھک مساعی اور دینی واعتقادی اثرات سے قومی اتحاد کو بڑا فائدہ پہنچا۔

اردو زبان کے علاوہ حضرت مولانا کو عربی تحریر پر بڑی قدرت حاصل تھی، "معـــارف السنـــن شرح الترمذی" کے علاوہ آپ کی کئی تالیفات عربی میں ہیں، جماعت اسلامی کے بانی وسربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بعض متشددانہ آراء کے خلاف انہوں نے کئی رسالے عربی میں تحریر کیے تاکہ دنیائے عرب کو واقفیت ہو جائے کہ ان سے بعض تحریرات میں لغزشیں سرزد ہوئی ہیں، جن سے بچنا اہل سنت والجماعت کو بے حد ضروری ہے، یہ ظاہر ہے کہ مولانا مودودی کو علوم شرعیہ نیز تاریخ اسلام میں کما حقہ درک حاصل نہیں ہوا، اقتصادی وسیاسی بصیرت سے احکامِ شرعیہ میں تفقہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ منقولات پر عبور، یہی وجہ ہے کہ بعض دینی تعبیرات اور تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کرنے میں ان کے قلم سے لغزش سرزد ہوئی ہے جو کوئی تعجب کی بات نہیں، البتہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ انسان لغزشوں سے متنبہ نہ ہو اور نہ احتیاط برتے۔

حضرت مولانا بنوری پاکستان کی ان نامور ہستیوں میں ہیں، جن کی عربی تحریرات کو دنیائے عرب خصوصاً شام ومصر کی حکومتوں نے سراہا اور ان کے علمی وثقافتی

کارناموں کے پیش نظر علمی عربی مجلسوں کا ممبر (عضو) اعزازی بنایا، سرزمین ہند و پاک میں سب سے پہلے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو یہ اعزاز ملا، پھر استاذ آصف علی اصغر کو، استاذ مولانا عبدالعزیز میمنی کا نام مجمع علمی دعربی دمشق کے اعضاء میں ۱۹۲۸ء سے داخل ہے، مولانا بنوری کو غالباً ۱۹۵۸ء سے عضو مراسل بنایا گیا (راقم الحروف کو یہ اعزاز ۱۹٦۴ء سے ملا) چنانچہ مملکت سیریا کے مجمع علمی عربی کے اعضاء کی فہرست میں یہی چند نام پاکستان کے زیر عنوان درج ہوتے ہیں، حضرت مولانا کو مملکت مصر قاہرہ کے مؤتمر العلماء المسلمین کی عضویت (ممبری) بھی حاصل تھی۔

جنرل ضیاء الحق کے فوجی اقتدار کے بعد پاکستان کے داخلی نظم ونسق کو درست کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی گئی، اسلامک آئیڈیولوجی کا چیرمین سپریم کورٹ کے جج (جواب ریٹائر ہوگئے) جسٹس محمد افضل چیمہ کو بنایا گیا، اور نئے سرے سے علماء وقانون دانوں کو کونسل کا ممبر بنایا گیا، ان میں حضرت علامہ بنوری بھی تھے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے اسلامی نظریاتی کونسل کے جلسے میں علامہ شرکت کے لیے راولپنڈی میں تھے کہ دل کا دورہ پڑا آپ کو فوجی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ مگر شام تک دوسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا، اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی عمر ۷۱ سال بتائی جاتی ہے۔

ملک کے صدر، چیف مارشل لاء ایڈ یٹر، گورنر اور علماء و بزرگان دین سبھوں نے اپنے اپنے تعزیتی پیغامات میں آپ کی بے مثال دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے صدر مسٹر جسٹس افضل چیمہ نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا کہ حضرت مولانا بڑے مذہبی عالم تھے، اور آپ کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کو پر کرنا بہت مشکل ہے، آپ کی رہنمائی میں سارے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی

رہی، آپ اپنی رائے ہمیشہ نہایت اطمینان وعقلی توجیہ کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ مخالفین کو سکوت کے سوا چارہ نہ ہوتا، آپ ہمیشہ اپنی رائے کا اظہار نہایت منصفانہ طور پر کرتے اور کسی بے جا طرفداری کا ثبوت نہ دیتے، اگرچہ پیرانہ سالی کی وجہ سے نیروئے جسمانی میں ضعف ظاہر ہو چکا تھا، مگر آپ کا دماغ نہایت حاضر تھا، اور قرآن وسنت کے ہر پہلو کا خیال رکھتے ہوئے مسائل کا حل نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے تھے۔

جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور کے اخبار کو اپنا تعزیتی بیان دیتے ہوئے فرمایا:

''مولانا کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، اور ان کی وفات سے جو خلأ پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہوسکتا، انہوں نے مولانا کی مغفرت کی دعا اور ان کے اہل وعیال کے لیے بارگاہِ خداوندی سے ملتجی ہوئے کہ ان کو اس صدمۂ جانکاہ پر صبرِ جمیل کی توفیق عطا کرے۔''

حضرت مولانا کو اپنے دوست احباب، تلامذہ اور طلباء کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے، اور نہایت بے تکلفی کا اظہار فرماتے۔

ایک تقریب کے موقعہ پر حضرت کو اس راقم کے یہاں آنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو درِ دولت پر یاددہانی کو حاضر ہوا، گھر پر معلوم ہوا کہ وہ تو دیر ہوئی جا چکے ہیں، واپس ہوا تو دیکھا کہ آپ خود پہنچ کر انتظار کر رہے ہیں، دیکھتے ہی فرمایا کہ میں آنے کا وعدہ کر چکا تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ نہ آتا، غرض اسی طرح برابر شفقت کی نظر رکھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی، سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں علمی، ثقافتی اور اجتماعی واخلاقی صفات کا جو انفرادی نمونہ آپ کی ذات میں نظر آتا تھا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔

ایک عرب شاعر کا خطاب مرنے والے سے کیا خوب ہے!

لَمْ تَمُتْ اَنْتَ اِنَّمَا مَاتَ مَنْ لَمْ　　يُبْقِ فِی المجد والمحامدذكر

لست مستسقيا لقبرك غيثا　　كيف يظمأ وقد تضمن بحرا

تم مرے نہیں، موت تو اس کی ہے، جو اپنے بعد اپنی شان و بزرگی اور نیک اعمال کا ذکر نہ چھوڑے۔

اپنی قبر کی سیرابی کے لیے تم کو کسی قطعۂ ابر سے التجا کرنے کی ضرورت نہیں، وہ قبر کیوں کر پیاسی رہ سکتی ہے جو خود اپنے میں ایک سمندر سموئے ہوئے ہے۔''

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ

یاسفیٰ علی یوسف

یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوسُفَ وَابیَضَّت عَینٰہُ مِنَ الحُزنِ

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمہ سے اس عاجز کو سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں حج کے دوران مدینہ منورہ میں شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا، اس وقت ان کی رفاقت میں افریقہ کے بزرگ حاجی عبدالرحمٰن مرحوم تھے اور حضرت مولانا ہی کی وجہ سے ان کی شفقتیں بھی مجھے حاصل رہیں، حج کے بعد حضرت مولانا غریب خانے پر (۳۲۸ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی) تشریف لاتے رہے اور اپنے ساتھ مجھے بھی مختلف مقامات پر لے جاتے تھے، بالخصوص حاجی وجیہہ الدین صاحب مرحوم کے دولت کدے پر حاضری ہوتی تھی، پھر جب مدرسۃ العربیۃ الاسلامیہ کے قیام کا ارادہ ہوا تو حضرت مولانا نے از راہِ شفقت مجھے بھی استخارہ کرنے کی سعادت بخشی، پھر میں حیدرآباد آ گیا لیکن حج کے کئی سفر ان کی ہم رکابی میں نصیب ہوئے، حضرت مولانا کو ملکی مسائل سے بھی خاص تعلق رہا ہے لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک کہ دین ان سے متاثر ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے کبھی کبھی حیدرآباد سے کراچی بھی طلب فرمایا ہے، ایک مرتبہ یوں بھی شفقت فرمائی کہ اب تم حیدرآباد چھوڑ کر ہمارے پاس آ جاؤ اور اس کو چلاؤ، پھر جب ہمارے ملک میں لسانی

ہنگامے کرائے گئے اور بعض علماء نے یہاں تک فرمایا کہ ہندوستان سے آنے والوں کو چاہیے کہ جو کچھ انھوں نے یہاں کمایا ہے وہ سب مقامی حضرات کو دے دیں تو حضرت مولانا کو بہت قلق ہوا اور کراچی سے حیدرآباد تشریف لائے، مجھے بھی طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس فتنے کو روکنے کے لیے تمھارا کیا مشورہ ہے؟ حضرت مولانا کو چونکہ اپنے جدِّ اعلیٰ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ نقشبندیہ سے بھی وابستگی تھی اس لیے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ کے عرس مبارک پر ان کو دعوت عرض کی جاتی تھی، ۱۹۷۶ء کے عرس مبارک پر انھوں نے تقریر بھی فرمائی تھی لیکن پھر دوسرے سال انھوں نے معذرت فرمالی اور یہ گرامی نامہ لکھا:

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

۱۳-۲-۱۳۹۷ھ

۱۳-۲-۱۹۷۷ء

گرامی قدر محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اس دفعہ آپ کی بابرکت مجلس میں حاضر نہ ہوسکنے کا افسوس ہے، کچھ ہفتوں سے اتوار کے روز کو دماغی توازن کو صحیح رکھنے کے لیے گوشۂ تنہائی میں گزارنے کا ارادہ کرلیا ہے، آج اتفاق سے ۱۱-۱۲ تک کا وقت ایک جگہ مدرسہ و مسجد کی بنیاد رکھنے کے لیے گلشن اقبال میں دیا تھا، جو مکان گوشۂ تنہائی کے لیے تجویز کیا ہے وہ وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں انتظار رہتا ہے، ٹیلیفون بھی نہیں، دراصل بزرگوں کی تجدید ذکر کے لیے تاریخ کا تعین میرے مسلکی ذوق کے خلاف بھی ہے، مجھے امید ہے کہ آپ میری ان

معذوریوں کی وجہ سے معاف فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ ولکم الشکر الجزیل

والسلام

محمد یوسف بنوری عفااللہ

حضرت مولانا کی وفاتِ حسرت آیات کی ایک تاریخ تو اوپر ہی سورۃ یوسف سے حاصل کی ہے اور اس قطعۂ تاریخ میں بھی ایک مصرع ہجری اور دوسرا عیسوی (کامل الاعداد) عرض کیا ہے:

آہ بگذشت شہیرِ عالم — علم دیں رانماندہ شباب

فخرِ علماء و نازشِ عرفاء — فرعِ خشک قوم راچو سحاب

''جان خلد است محمد یوسف'' — ''عزت فضل، ماہ عالمتاب''

۱۳۹۷ھ — ۱۹۷۷ھ

کوثرنیازی

جنہیں میں نے دیکھا

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری سے تعارف تو بہت پرانا تھا مگران سے تفصیلی ملاقاتیں ۱۹۶۵ء میں ہوئیں جب مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے پاکستان بھر سے علمائے کرام کا ایک نمائندہ اجلاس کراچی میں منعقد کیا تھا، حضرت مفتی صاحب اور مولانا بنوری مرحوم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، اس لیے مولانا بنوری مرحوم اس اجتماع میں بطور خاص شریک ہوئے، ملاقات ہوئی تو بے حد شفقت فرمائی، نیوٹاؤن میں اپنی جامع مسجد اور دارالعلوم [جامعہ] دیکھنے کی دعوت دی، کھانا بھی کھلایا، چائے بھی پلائی اور کتابیں بھی عطا فرمائیں اور اس طرح مولانا مرحوم سے ایک مستحکم رشتہ استوار ہوگیا جو ان کی وضع داری اور بزرگانہ شفقت کی وجہ سے زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہا، مولانا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور ان کے علوم حدیث کو محفوظ کرنے اور کتابی شکل یں دوسروں تک پہنچانے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، عربی زبان پر انہیں عبور کامل حاصل تھا اور اس مین یوں لکھتے اور بولتے تھے جیسے ان کی مادری زبان ہو، مصر اور سعودی عرب کے بعض علمی مذاکروں میں بلائے گئے تو اس حسن وخوبی سے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی کہ وہاں کے اہل علم کو گرویدہ بنالیا، اب ایک عرصے سے عرب ملکوں میں مدعو کیے جاتے تھے اور رابطہ عالم

اسلامی کی طرف سے سال بہ سال حج کے موقع پر بھی بلائے جاتے تھے، میں نے انہیں کئی مرتبہ عرب طلبہ اور علماء کے ہجوم میں گھرا دیکھا، یہ سب شیخ بنوری کے صدق مقال کے مداح اور معترف تھے، حضرت مولانا اول وآخر عالم دین تھے، سیاست انہیں چھوتک نہیں گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ جس بات کوحق جانا ڈنکے کی چوٹ کہا، یہ نہیں سوچا کہ اس سے کون خوش ہوگا اور کون ناراض، رقیق القلب اتنے کہ بات بات پر خوب صورت کٹوروں جیسی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے، گفتگو کے دوران میں درد وسوز میں ڈوب کر آہ کھینچتے تو یوں لگتا جیسے ایک جلتے ہوئے سینے سے دھواں اٹھ رہا ہو، عشق رسول ﷺ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، حضور ﷺ کا ذکر ہوتا تو ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا، ایک مرتبہ نعت کے اشعار ان کے سامنے پڑھے جارہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

کارنامے تو حضرت بنوریؒ کے بے شمار ہیں لیکن ان کا اصل صدقۂ جاریہ نیو ٹاؤن میں ان کی تعمیر کردہ جامع مسجد اور شاندار دارالعلوم ہے، جو بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ پاکستان میں اپنی مثال آپ ہے، عالم عرب سے شیخ الازہر، امام مسجد نبوی ﷺ، امام مسجد حرام اور بعض دوسرے زعماء تشریف لائے تو میں انہیں نیوٹاؤن کے دارالعلوم [جامعہ] میں بھی لے گیا، واپسی پر یہ سب حضرات شیخ بنوری اور دارالعلوم کی عظمت کے گن گارہے تھے۔

مولانا کے انتقال پر ان کے خدام نے انہیں دارالعلوم [جامعہ] ہی کے ایک کونے میں دفن کیا ہے، میں ان کی قبر پر فاتحہ کے لیے حاضر ہوا تو قال اللہ وقال الرسول کی اس پاکیزہ فضا میں شیخ کی یہ کچی قبر مجھے بڑی ہی پرانوار نظر آئی:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ماہر القادری



تقسیم ہند سے قبل دیوبند کے علماء میں سب سے پہلے مولانا مرتضی حسن چاند پوری کی تقریر قصبہ ڈبائی میں سننے کا اتفاق ہوا تھا، میں ان دنوں کبیر ہائی اسکول (ڈبائی) کی ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا، مولانا مرحوم اپنے نام کے ساتھ ''ابن شیر خدا'' لکھا کرتے تھے، اس واقعہ کو اب چھپن برس ہورہے ہیں، ۱۹۲۱ء میں تحریک موالات کا زور تھا اور ہمارے نواح میں ''گاندھی کیپ'' کا رواج تو تھا ہی، مگر مسلمانوں میں ''محمود کیپ'' کا بھی رواج ہو چلا تھا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ خاص وضع کی ٹوپی پہنتے تھے، محمود کیپ، گاندھی کیپ کی بالکل ضد تھی، گاندھی کیپ کشتی نما تھی اور محمود کیپ گول تھی، ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد میرا جانا ہوا تو حضرت علامہ شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریریں سنیں اور ان سے خاصا ربط ضبط ہوگیا، مال گزاری کے سب سے بڑے وکیل اور صاحب تقوی بزرگ مولوی فیض الدین صاحب کی کوٹھی پر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے، مصافحہ کرنے اور ان کی گفتگو سننے کی سعادت حاصل ہوئی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ بھی حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ حیدرآباد دکن تشریف لائے تھے مگر اس وقت تک ان کی شہرت نہیں ہوئی تھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم ومغفور سے ۱۹۴۶ء میں دلی کے کتب

خانہ عزیزیہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا، حضرت مولانا قاری محمد طیب سے دسیوں بار ملاقاتیں رہیں اور ان کی معرکہ آراء تقریریں سنیں، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثانی سے بھی دہلی میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں، پاکستان بننے سے سال ڈیڑھ سال پہلے قاری زاہر قاسمی دلی سے مجھے دیوبند لے گئے وہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، دوسرے دن شام کے وقت دیوبند ریلوے اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے ملاقات ہوگئی، مولانا مرحوم کانگریس کے کسی جلسہ میں شرکت کے لیے باہر تشریف لے جارہے تھے، قاری صاحب نے میرا تعارف کرایا، اس پر حضرت مولانا مدنی نے فرمایا: ''ماہر القادری بدایونی''، میں نے عرض کیا: ''میں ''بدایونی'' نہیں ہوں، ضلع بلندشہر کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں''۔

اس تمہید و تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اکابر دیوبند میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف پاکستان بننے کے بعد حاصل ہوا، ہاں! البتہ ان کا نام بارہا سنا تھا، ان دنوں مولانا مرحوم مدرسہ عربیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے، حضرت مولانا کی خدمت میں جب بھی حاضر ہوتا تو بڑی محبت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، ان کا موزوں اور متناسب قد، خوب کھلتی ہوئی رنگت، خوش نما ڈاڑھی، ان کے چہرے مہرے میں جاذبیت اور دل کشی تھی۔

ایک بار ان کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کی بالائی منزل کے کمرے میں تشریف فرما ہیں، اس کمرے میں بڑے سلیقہ کے ساتھ کتابوں کی دیدہ زیب الماریاں رکھی تھیں، قالین نما فرش جس کی آب و تاب دیدنی تھی، حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کمرے میں جو سامان آرائش آپ دیکھ رہے ہیں اس کا مدرسہ کی آمدنی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایک صاحب خیر نے ''دارالحدیث'' کے لیے فرش فروش اور الماریاں خرید کر دی ہیں، پھر مولانا مرحوم نے راقم الحروف کے لیے خنک مشروب منگوایا، میں کوکا کولا کی بوتل پی رہا تھا اور گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، فرمایا کہ یہاں مہمانوں کی تواضع مدرسہ

کی آمدنی سے نہیں کی جاتی، یہ بوتل میں نے اپنے داموں سے منگوائی ہے، پھر وہ مجھے نیچے لے گئے، مدرسہ کا مطبخ دکھایا جس میں خمیری روٹیاں پک رہی تھیں، اس سلسلہ میں پوری تفصیل بتائی کہ اس مدرسہ میں طلباء کو کھانا تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ دسترخوان پر کھلایا جاتا ہے، ایک خمیری روٹی اتنے وزن کی ہے، مدرسہ کا مطبخ بڑا صاف ستھرا تھا اور روٹیوں کی شکل وصورت بتارہی تھی کہ آٹا اچھا ہی نہیں بلکہ بہت ہی اچھا ہے، اس مدرسہ کا حسن انتظام مولانا مرحوم کی توجہ کا رہین منت تھا۔

مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم، علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص الخاص تلامذہ میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، مدرسہ دیوبند کے اکابر اساتذہ میں جب اختلاف ہوا اور ڈابھیل میں بعض چوٹی کے دیوبندی علماء نے نیا دارالعلوم آباد کیا تو مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں کئی برس مسند درس وتدریس پر فائز رہے۔

مولانا مرحوم فن حدیث میں قابل ذکر بصیرت اور تبحر رکھتے تھے، عربی ادب سے بھی غیر معمولی شغف تھا، عربی میں بے تکلف گفتگو اور شستہ تقریر وتحریر پر قدرت تھی، ترمذی شریف کی شرح عربی زبان میں کئی جلدوں میں لکھی۔

نیشنل بینک کے چیئرمین ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم جو کئی زبانیں جانتے تھے اور سبعہ معلقات کے اشعار داغ کے شعروں کی طرح روانی کے ساتھ سناتے، ایک دعوت ولیمہ میں وہ راقم الحروف سے کہنے لگے کہ ''ولیمہ'' کے اصل معنی کیا ہیں، اس کا مادہ کیا ہے؟ اس کی مجھے تلاش تھی، مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ ہمارے پاکستان میں ایک ایسا عربی داں موجود ہے جس نے ''ولیمہ'' کے معنی پوری تفصیل سے اس کے مادہ، مصدر اور اشتقاق کے ساتھ بتائے، اس ضمیر کا مرجع مولانا یوسف بنوری کی شخصیت تھی۔

مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم ومغفور کے اسلاف میں حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے شیخ طریقت گذرے ہیں، مولانا مرحوم کے والد ماجد بھی صاحب علم

وفضل اور دوسری عجیب وغریب خصوصیات کے حامل تھے، طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور بڑے تجربہ کار اور جہاندیدہ تھے، ان کی وفات کو تین چار برس ہوئے ہوں گے، مولانا بنوری مرحوم کی پوری زندگی علم دین سیکھنے اور سکھانے میں گذری ہے، ان کا شمار پاکستان اور ہندوستان کے اجل علماء میں ہوتا ہے، مزاج میں حدت تھی جو بعض اوقات دین کی مدافعت میں شعلہ انگیز بن جاتی۔

مولانا مرحوم نیوٹاؤن کی جس دیدہ زیب مسجد کے متولی اور مدرسہ عربیہ کے مہتمم تھے وہ مدرسہ اور مسجد دونوں عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، میں نے ایک بار دیکھا کہ امریکہ کے سیاح مسجد کے فوٹو اتار رہے ہیں مگر پھر فوٹو کی ممانعت کردی گئی، نیوٹاؤن کا دارالعلوم [جامعہ] مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد اور اخلاص کے سہارے پروان چڑھا، مولانا مرحوم کی دیانت، تقوی اور علم وفضل کے سب معترف اور مداح تھے۔

کئی برس سے مولانا کا یہ معمول تھا کہ رمضان المبارک حرمین شریفین میں گذارتے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتکاف کی سعادت انہیں میسر آتی، ان کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا، درد کی شدت ہوتی تو دوسرے آدمی کے سہارے چل کر مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہوجاتے۔

ڈھائی تین مہینہ ہوئے جنرل ضیاء الحق نے انہیں اسلامی کونسل کا رکن مقرر کیا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا مرحوم اسلام آباد گئے ہوئے تھے، وہیں حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہوگئی، ان کی وفات پر دینی حلقوں میں کہرام برپا ہوگیا، اخبارات نے تعزیت کے ساتھ زبردست خراج عقیدت بھی پیش کیا، اس قحط الرجال میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات علم واخلاق کا بہت بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالی آخرت میں ان کے مدارج بلند فرمائے، آمین۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

مولانا محمد یوسف بنوری

۱۸؍اکتوبر منگل کا دن تھا، صبح فجر کی نماز سے میں فارغ ہی ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، ٹیلی فون کرنے والے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ ترجمان ''تعمیر حیات'' کے ایڈیٹر عزیز مکرم مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی تھے انہوں نے بتلایا کہ مولانا علی میاں نے فرمایا ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع دے دوں کہ رات یہاں دارالعلوم میں پاکستان ریڈیو سے مولانا محمد یوسف بنوریؒ صاحب کے انتقال کی خبر سنی گئی ہے، صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ مولانا مرحوم اسلامی مشاورتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے تھے، وہیں یہ حادثہ واقع ہوا۔

اس وقت صرف اتنی ہی بات معلوم ہوسکی، ایسی کسی اطلاع کا پہلا حق یہی ہے کہ دل و جان سے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہا جائے اور جانے والے کے لیے اللہ تعالی سے رحمت و مغفرت کی استدعا کی جائے، اللہ تعالی نے توفیق دی اور دعا نصیب ہوئی ،آئندہ بھی اللہ تعالی مولانا مرحوم کے حق کے مطابق دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔

۱۸؍اکتوبر کی اس پہلی اطلاع کے بعد سے حادثہ کی تفصیل کا انتظار رہا، نومبر کے دوسرے ہفتہ میں دارالعلوم اکوڑہ خٹک (پشاور) کا ماہ نامہ ''الحق'' آیا، سب سے پہلے

اسی سے واقعہ کی درج ذیل تفصیل معلوم ہوئی۔

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں جنرل ضیاء الحق کی قائم کی ہوئی اسلامی مشاورتی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا، مولانا مرحوم اس کے اہم رکن تھے، اجلاس کی شرکت کے لیے کراچی سے تشریف لائے ہوئے تھے، صاحبزادے مولوی محمد سلمہ ساتھ تھے، گورنمنٹ ہاسٹل کے ایک کمرہ میں قیام تھا، ۱۴ر اکتوبر (جمعہ) اور ۱۵ر اکتوبر (شنبہ) کی درمیانی شب میں کونسل کے اجلاس سے ساڑھے نو بجے کمرہ پر تشریف لائے، رات اپنے معمول کے مطابق گذاری، ۱۵ر اکتوبر (شنبہ) کی صبح غسل خانے میں تھے، اچانک ایک دھچکا سا لگا جس سے گلا کچھ کھنچ سا گیا، ڈاکٹری معائنہ کے لیے پولی کلینک اسلام آباد تشریف لے گئے، وہاں سے گیارہ بجے واپسی ہوئی۔

مولانا نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی، ''البلاغ'' کراچی کے مدیر مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا سمیع الحق صاحب (مدیر ''الحق'') کمرہ ہی پر موجود تھے، مولانا ان حضرات سے بے تکلف باتیں کرتے رہے، ان حضرات نے اصرار بھی کیا کہ اس وقت آپ زیادہ بات نہ کریں آرام فرمائیں، لیکن مولانا نے یہی فرمایا کہ نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

ساڑھے بارہ بجے دوبارہ سخت اٹیک ہوا، جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا، چہرہ کا سرخ رنگ زرد پڑ گیا، فرمایا کہ اس وقت بالکل نئی کیفیت محسوس ہو رہی ہے، زبان پر ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کا ورد جاری ہو گیا، مشاورتی کونسل کے چیئرمین جسٹس افضل چیمہ صاحب بھی موجود تھے، سی، ایم، ایچ پہنچانے کا پروگرام بنا، ایمبولینس آنے میں بہت دیر لگی، ۴ بجکر ۲۰ منٹ پر آپ سی، ایم، ایچ کے آفیسرز وارڈ کے ایمرجنسی روم میں داخل کیے گئے، وہاں پہنچ کر طبیعت کافی بحال ہو گئی، سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ایک درجہ اطمینان سا ہو گیا، دوسرے دن اتوار اور اس کے بعد والی رات کو بھی آپ یہیں زیر

علاج رہے، غالباً اتوار اور پیر کی درمیانی رات میں تیسرا اور آخری اٹیک ہوا اور پیر کی صبح ۵ بجے کے لگ بھگ واصل بحق ہو گئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

''الحق'' کے مدیر مولانا سمیع الحق صاحب نے آگے لکھا ہے کہ:

''وفات اپنے اندر شان ابوذری لیے ہوئے تھی، ایسی حالت میں کہ ملت کا یہ غم گسار ملت کے درد وغم ہی کے سلسلے میں حالت سفر میں تھا اور وفات کے وقت قریب کوئی عزیز بھی نہ تھا، کیونکہ ہسپتال کی طرف سے کسی عزیز کو ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی، اسی حال میں آخرت کا یہ سفر ہوا..........۔''

آگے لکھا ہے کہ:

''یہ امر بے حد افسوس اور حیرت کا باعث ہے کہ ہسپتال کی طرف سے کسی عزیز کو اطلاع نہیں دی گئی، پہلی اطلاع کئی گھنٹے بعد جنرل ضیاء الحق صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر کو دی گئی، ان کے توسط سے چیئرمین اسلامی کونسل اور اس کے بعد عزیز واقارب کو۔''

مولانا کی میت کو ہسپتال سے راولپنڈی مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب کی اقامت گاہ جامعہ اسلامیہ (کشمیر روڈ) لے آیا گیا، موصوف ہی کے اہتمام سے یہیں آخری غسل دیا گیا اور تجہیز وتکفین ہوئی، جامعہ اسلامیہ میں لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا، اکوڑہ خٹک گیارہ بجے اطلاع ہوئی وہاں کے دارالعلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) نیز ان کے صاحبزادے مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ''الحق'' اور دوسرے حضرات ۲ بجے جامعہ اسلامیہ راولپنڈی پہنچے، ظہر کے بعد ۳ بجے مولانا عبدالحق صاحب کی اقتدا میں نماز جنازہ ہوئی، اس کے بعد آپ کا تابوت ایئرپورٹ لے جایا گیا اور ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ کر رات کو ۹ بجے کے بعد نیوٹاؤن میں

آپ کے قائم کیے ہوئے ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ'' اور آپ کی بنوئی ہوئی جامع مسجد کے ایک جانب آپ کو خدا کی رحمت اور اس زمین کے سپرد کر دیا گیا جو بنی آدم کا آخری ٹھکانا ہے۔

اب سے ۵۲ سال پہلے (۱۳۴۵ھ) دارالعلوم دیوبند میں راقم سطور کی تعلیم کا آخری سال تھا، اس سال کے ختم پر کچھ واقعات قضاء وقدر کے فیصلہ کے نتیجہ میں ایسے پیش آئے کہ دارالعلوم کے صدر المدرسین امام العصر حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دارالعلوم کے متعدد اور اساتذہ کو دارالعلوم سے قطع تعلق کر لینا پڑا، بظاہر یہ واقعہ بہت ہی نامبارک تھا، لیکن اللہ تعالےٰ کی حکمت اور رحمت نے اس شر سے یہ خیر پیدا فرمایا کہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کے ایک معمولی سے ''مدرسہ تعلیم الدین'' کے ذمہ داروں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ہندوستان کا دوسرا ''دارالعلوم دیوبند'' یا ''جامعہ اسلامیہ'' بنانے کا فیصلہ کر لیا اور ضروری انتظامات کر کے ان سب حضرات کو اجتماعی طور سے وہاں بلا لیا، ان حضرات کے ساتھ دارالعلوم کے مختلف درجات کے طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد چلی گئی، اس طرح ۱۳۴۶ھ میں گجرات کے علاقہ میں یہ عظیم الشان ''جامعہ اسلامیہ'' قائم ہوگیا، مولانا بنوری بھی ان طلبہ میں تھے جو دارالعلوم دیوبند چھوڑ کے ڈابھیل کے اس جدید ''جامعہ اسلامیہ'' میں چلے گئے۔ اس وقت وہ غالباً متوسطات پڑھ رہے تھے، انہوں نے دورہ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ہی میں پڑھا، علمی استعداد کے لحاظ سے وہ طلبہ میں بہت ممتاز اور فائق تھے، اللہ تعالیٰ نے طالبعلمانہ شوق اور محنت کے ساتھ ذہانت اور قوت حافظہ کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا، مزید برآں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی خاص فضل تھا کہ حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہٗ کے ساتھ عام رشتہ تلمذ کے علاوہ ان کو گہرا قلبی تعلق بھی تھا اور حضرتؒ کی بھی ان پر خاص نظر عنایت تھی، پھر اس طالب علمی سے فراغت کے بعد بھی انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے وابستہ اور حضرت ہی کی خدمت میں رہ پڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایسا

ہی کیا [1]

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد سب سے پہلے آپ نے حضرت کی سوانح حیات عربی زبان "نفحة العنبر" کے نام سے لکھی۔ نیز قرآن مجید کے مشکلات سے متعلق آپ کے خاص افادات کو اپنے تفسیری مقدمے کے ساتھ ''مشکلات القرآن'' کے نام سے شائع کیا، فصیح عربی تحریر وتقریر پر ان کو شروع ہی سے وہ قدرت تھی، جو ہمارے حلقہ کے بہت کم اہل علم کو ہوتی ہے اور یہ بھی غالباً حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے فیضانِ کا نتیجہ تھا، حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد وہ ڈابھیل بلا لیے گئے اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ''جامعہ اسلامیہ'' کے وہی شیخ الحدیث اور صدر المدرسین یعنی حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہٗ کے جانشین ہوئے۔

مولانا مرحوم کا اصل وطن قریہ بنور (پشاور) تھا [2] (امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جلیل القدر خلیفہ خواجہ سید آدم بنوری کی آپ اولاد میں ہیں) ۱۹۴۷ء میں جب ایک ملک کے دو ملک (ہند اور پاکستان) بنے، اس وقت آپ ''جامعہ اسلامیہ'' ڈابھیل کے شیخ الحدیث تھے، آپ نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ نہیں فرمایا، یہیں رہے اور کئی برس تک رہے بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ آپ کی وہاں زیادہ ضرورت ہے اور امید ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ زیادہ کام لے گا، تو آپ پاکستان منتقل ہوگئے، پہلے کچھ عرصہ تک ''دارالعلوم ٹنڈو الہ یار'' (حیدرآباد سندھ) میں استاذ حدیث رہے، پھر طے کیا کہ

---

[1] مگر افسوس ہے کہ کچھ عرصہ بعد انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کا دردِ دولت چھوڑ کر وطن آنا پڑا۔ کئی سال تک تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ سیاسی مشغلہ رہا۔ بعد ازاں ڈابھیل والوں کی طلب پر وہاں چلے گئے۔ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے جتنا علمی فائدہ مولانا بنوری نے حاصل کیا، اتنا حضرت کے کسی دوسرے شاگرد نے حاصل نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔ (نعمانی)

[2] بنور نام کا پشاور میں کوئی قریہ نہیں ہے بلکہ ریاست پٹیالہ میں سرہند کے قریب ہے، امام ربانیؒ کے خلیفہ اعظم شیخ آدم بنوری کی نسبت اس قریہ کی طرف ہے اور انہی کی نسبت سے ان کی اولاد بھی بنوری کہلاتی ہے۔ حضرت مولانا کا وطن اصلی گڑھی میر احمد شاہ (پشاور کا ایک محلّہ تھا)۔

خاص کراچی میں ایک ایسی دینی درسگاہ قائم کی جائے جو ''دارالعلوم دیوبند'' کا بدل اور اس کی بنیادی خصوصیات کی حامل ہو، پھر اللہ کی توفیق سے اس کی بنیاد ڈالی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اپنے عزم وہمت اور جانبازی وقربانی سے بہت تھوڑی مدت میں (صرف ۲۰۔۲۱ سال میں) ہر حیثیت سے اس کو وہاں پہنچادیا، جہاں تک آغاز میں اپنے تخیل کی پرواز بھی نہیں رہی ہوگی۔

مولانا مرحوم کا قیام جب تک ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' میں رہا، ملاقات کے مواقع پیدا ہوتے رہتے تھے، پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد جہاں تک معلوم ہے وہ کبھی ادھر تشریف نہیں لائے، راقم سطور نے دو دفعہ ادھر کا سفر کیا، دونوں ہی دفعہ بہت مختصر ملاقات کا موقع مل سکا، ہاں گزشتہ دس بارہ برس میں حجاز مقدس میں حج کے موقع پر یا رمضان مبارک میں قریباً ہر سال اللہ تعالیٰ نے بڑے اطمینان کی ملاقاتیں اور یکجائی کے مواقع میسر فرمائے، وہ سفر حج کے علاوہ اکثر ماہ رمضان میں بھی عمرہ کے لیے اور مسجد حرام یا مسجد نبوی میں اعتکاف کی غرض سے حجاز مقدس کا سفر فرماتے تھے اور ۱۹۶۵ء کے بعد سے ''رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ'' کی رکنیت کے طفیل قریباً ہر سال اس بے مایہ اور سیہ کار کو بھی حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوتی ہے، مولانا کے ساتھ مبارک ترین طویل اجتماع اور یک جائی کا موقع اب سے دوسوا دو سال پہلے ۱۳۹۵ھ کے رمضان مبارک میں نصیب ہوا، جب کہ اس کے آخری عشرہ میں مولانا مرحوم اور اللہ کے اور بھی نیک بندے مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کے ایک دالان میں معتکف تھے اور اس سیہ کار نے بھی اسی دالان میں مولانا کے بستر کے قریب ہی رہ کر اس امید پر وہ عشرہ گزارا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اچھے بندوں کے قرب کی برکات سے محروم نہ فرمائے گا، "اولئك قوم لایشقیٰ جلیسھم" پھر اس کے دو ہی مہینے بعد اس سال کے حج میں بھی مکہ معظمہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی مدرسہ صولتیہ کی سہ پہر کی مجلس میں کئی بار ملاقات ہوئی اور یہی

آخری ملاقات تھی، اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو باہمی حسن ظن اور اخلاص ومحبت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، اس لیے ہر ملاقات میں روح کو لذت ومسرت نصیب ہوتی تھی، میری نظر میں مولانا مرحوم علم میں، اور خاص کر علم حدیث میں بہت بڑے تھے اس لیے میرا رویہ ان کے سامنے وہی رہتا تھا جو علمی اکابر کے سامنے رہنا چاہئے، لیکن اتفاق سے میری عمر مولانا سے کچھ زیادہ تھی[1]۔ اور حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہٗ کے رشتۂ تلمذ کے لحاظ سے بھی مجھے قدامت حاصل تھی، اس لیے مولانا کا معاملہ اور برتاؤ میرے ساتھ وہ تھا جو اہل علم کا ان معاصرین کے ساتھ ہوتا ہے جن کو وہ اپنا بڑا سمجھتے ہیں، حالانکہ میں ہرگز اس کا مستحق نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا میں بہت سے کمالات جمع کردیے تھے، لیکن علم کا کمال دوسرے کمالات پر غالب تھا، ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ جامع ترمذی کی شرح ''معارف السنن'' ہے، جس کی ۶ ضخیم جلدیں اب سے کئی سال پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان ۶ جلدوں میں کتاب کے قریباً صرف چوتھائی (۱/۴) حصے کی شرح ہوئی ہے، ۳ چوتھائی کے قریب کتاب باقی ہے، اس کی تکمیل کے لئے کم از کم اتنی ہی جلدیں اور لکھی جائیں، لیکن ادھر کئی سال سے مولانا مرحوم علمی جدوجہد کے بعض ایسے کاموں میں مصروف اور منہمک ہوگئے جن کی وجہ سے "معارف السنن" کی تصنیف کا کام ان سالوں میں بالکل نہیں ہوسکا، میں نے کسی سے سنا تھا کہ مولانا کا خیال یہ ہے کہ جامع ترمذی کے اہم حصہ کی شرح کا کام پورا ہوگیا اس لیے کتاب کی تکمیل کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اب سے دو سال پہلے رمضان مبارک ۱۹۷۵ء میں جب مدینہ منورہ میں پورا ایک عشرہ مولانا کے ساتھ رہنے کا موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) تو میں نے مولانا سے اس بارہ میں بھی گفتگو کی اور اصرار کیا کہ "معارف السنن" کی باقی جلدیں بھی ضرور لکھیں، مولانا نے فرمایا تھا کہ فی الحال میں اس کا ''مقدمہ'' لکھ رہا ہوں، اس سے فارغ

---

[1] مولانا بنوری مرحوم کی پیدائش ۶ ۱۳۲۶ھ کی بتلائی گئی ہے اور میری شوال ۱۳۲۳ھ کی ہے۔

ہونے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب کی تکمیل کی بھی کوشش کروں گا، اس گفتگو کے بعد جو دو سال گزرے ان میں مولانا کی جو دوسری عملی مصروفیتیں رہیں، ان کے پیشِ نظر راقم سطور کا اندازہ ہے، کہ "معارف السنن" کا کام ان دنوں میں بالکل نہ ہو سکا ہوگا، خدا کرے کہ مقدمہ ہی پورا ہو چکا ہو، "معارف السنن" کے مطالعہ سے مولانا بنوری مرحوم کی علمی خصوصیات اور خاص کر فن حدیث میں ان کے رسوخ و تبحر اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، حضرت الاستاذ الامام الکشمیری قدس سرہٗ کی خاص تحقیقات سے واقفیت کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ بھی اس عاجز کے نزدیک "معارف السنن" ہی ہے۔

مولانا کی مجاہدانہ مہمات اور عملی خدمات کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستانی پارلیمنٹ اور حکومت پاکستان سے قادیانیوں کے ''غیر مسلم اقلیت'' قرار دیے جانے کا فیصلہ کرالینا ہے، مرحوم اس دینی مطالبے کی تحریک کے مسلمہ اور متفقہ قائد اور امام تھے، جس ملک کی حکومت کا سب سے پہلا وزیر خارجہ قادیانیت کا کھلا علمبردار اور مبلغ سر ظفر اللہ خاں رہا ہو اس حکومت سے یہ منوالینا اور ملک کے دستور میں شامل کرا دینا کہ، ''مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مسیح موعود ماننے والے اور اس پر ایمان لانے والے مسلمان نہیں ہیں، بلکہ پاکستان کی دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیت ہیں، اور پاکستان میں ان کی قانونی حیثیت ایک غیر مسلم اقلیت ہی کی ہے،'' اتنا عظیم کارنامہ ہے جس کو نصرت خداوندی کا ''معجزہ'' ہی کہا جا سکتا ہے، یہ محاذ مولانا مرحوم ہی کی قیادت میں فتح ہوا اور اس کا اثر پورے عالمِ اسلامی پڑا۔

جب سے مولانا سے واقفیت ہوئی اور ہندوستان و پاکستان یا حجاز مقدس میں جب بھی ملاقات ہوئی ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کمال علمی کے ساتھ علم کے مطابق عمل کے اہتمام، اخلاص، للّٰہیت، خشیت و انابت، ورع و تقویٰ اور ان سب کے ساتھ دین کا درد بھی بھرپور عطا فرمایا تھا، اور جس بندہ میں اللہ تعالیٰ یہ اوصاف جمع فرما دے بلاشبہ اس کو وراثتِ نبوت کا بڑا حصہ نصیب ہوا۔

مولانا نے اپنے اساتذہ واکابر کے طریقہ پر ''مدرسہ'' کے ساتھ ''خانقاہ'' سے بھی استفادہ کیا تھا، راقم سطور نے باوثوق ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے مولانا نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا شفیع الدین رحمۃ اللہ سے بیعت کی تھی، ایک زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اصلاحی تعلق رہا تھا، غالبًا اس کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور جیسا کہ معلوم ہوا ہے حضرت نے اجازت سے بھی سرفراز فرمایا۔

مولانا کے مزاج میں ''شدت فی امر اللہ'' بھی بدرجۂ کمال تھی، جس بات کو دین کے خلاف اور جس فکر وخیال کو ناقابل درگزر زیغ وضلال سمجھے اس کے خلاف جنگ کرنا اپنے لیے ضروری سمجھے اور کوئی مصلحت اور کسی ملامت کا خوف اور اپنی شخصیت ومقبولیت کو سخت سے سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ بلکہ یقین بھی ان کو اس اقدام جنگ سے نہیں روک سکتا تھا، ان کا حال اس معاملہ میں وہی تھا جو مرحوم مولانا محمد علی جوہرؒ نے (اللہ تعالی کی طرف سے) کہا تھا:

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

جن لوگوں کو مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انھیں چاہے ان کی بعض رایوں اور طرز وطریق کار سے اتفاق نہ ہو لیکن اس میں شک نہ ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ ادائے فرض کی نیت سے اس احساس کے ساتھ کرتے تھے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو جرم مداہنت کا مجرم ہوں گا اور آخرت میں خداوند ذوالجلال کے سامنے مجھے اس کی جواب دہی کرنی پڑے گی، اللہ تعالیٰ ان کے تمام حسنات وخدمات کو قبول فرمائے اور ہماری ان کی سب غلطیوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

اللهم اغفرلنا وارحمنا وعاملنا بنا انت اهله ولا تعاملنا بنا نحن اهله، انت اهل المغفرة واهل الجود واهل الكرم واهل الاحسان.

مَولَانازَاھِدالرَّاشِدِی



جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ رب العزت دنیا سے علم کو یوں نہیں اٹھائیں گے کہ کتابوں سے سلب کر لیا جائے، بلکہ علم اس طرح اٹھے گا کہ اہل علم یکے بعد دیگرے دنیا سے اٹھتے چلے جائیں گے، ان کے بعد جہال ان کے جانشین بنیں گے، جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ کے وصال نے ''رفع علم'' کے اس احساس کو شدید تر کر دیا ہے اور اہل علم کی یکے بعد دیگرے رخصتی کے ساتھ ساتھ مدارس ومکاتب کے بانجھ پن کا تقابل کیا جائے تو مستقبل کا ایک ہولناک نقشہ سامنے آتا ہے۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام تر زندگی علم کی اشاعت وترویج میں گذاری ہے اور وہ صرف اور صرف علم ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں، اگرچہ راقم الحروف کو ان کی خدمت میں زیادہ مرتبہ حاضری اور شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا تاہم تحریک ختم نبوت کے دوران ایک جلسہ عام کے موقع پر جب پہلی بار اس مرد درویش کی زیارت کی تو ذہن میں غزالی، رازی، ابن رشد، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر رحمہم اللہ اجمعین اور ان جیسے اساطین علم وفضل کے ہیولی تازہ ہو گئے جن کے علم وفضل سے دنیا صدیوں سے فیض یاب ہوتی چلی آ رہی ہے اور ہوتی چلی جائے گی۔

سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے صرف علم کی ترویج واشاعت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا، بلکہ اعتقادی محاذ پر کفر وارتداد اور الحاد و زندقہ کے فتنوں کا بھی جرأت مندانہ تعاقب کیا، قادیانیت کا فیصلہ کن محاسبہ، غلام احمد پرویز کے فتنہ انکار حدیث کی سرکوبی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ملحدانہ افکار کی بیخ کنی اور جناب مودودی صاحب کے تجدد پسندانہ خیالات پر کامیاب علمی گرفت سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے اہم ترین کارنامے ہیں اور نئی نسل ان اعتقادی فتنوں کی بروقت نقاب کشائی پر سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ سپاس گذار رہے گی۔

آج سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں، ان کی زندگی ہمارے سامنے ہے، ان کا مقدس مشن اور جدو جہد ہم سے ان کے نقش قدم پر چلنے کا تقاضہ کر رہا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ''رفع علم'' کی اس تیز رفتاری میں اپنے کردار کا جائزہ لینا ہے، ہمارے پاس مدارس، مکاتب اور علمی اداروں کی کمی نہیں، لیکن تدریس، تحقیق، تبلیغ، اصلاح وارشاد اور تحریر جیسے ناگزیر عملی شعبوں کو ''رجال کار'' نہیں مل رہے، ہر طرف سناٹا ہے، نئی نسل میں علم و تحقیق میں وقت ''ضائع'' کرنے کی بجائے ظاہری نمود ونمائش اور ''شارٹ'' راستوں سے ''منزل'' تک پہنچنے کی ہوس وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے، تعلیم کا معیار روز افزوں دگرگوں ہے اور تربیت سرے سے عنقا ہو گئی ہے اور سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ ہم میں ہر شخص اپنی ڈگر پر قائم رہتے ہوئے حالات کی تبدیلی کے لیے کسی ''معجزہ'' کا منتظر ہے۔

سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی جدائی کو اس پس منظر میں بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیے کہ اس سے بہت سے مخفی گوشے سامنے آئیں گے، نظر وفکر کو نئی جولانگاہیں ملیں گی اور سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ یعنی ''علم وفضل اور جرأت و استقامت'' کی جدائی کو محنت اور عمل کے ساتھ کم کرنے کا احساس پیدا ہوگا۔

کیا ہمارے ارباب علم وفضل سید بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کے اس پہلو پر غور کرنا پسند فرمائیں گے ....؟؟!!